ذُوالقعدہ ۱۴۴۷ھ
اپریل ۲۰۲۶ء

مسلسل اشاعت کے 60 سال

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- قرآن حکیم سے ہمارا تعلق
- فکرِ آخرت
- غزہ سے کابل: اُمّت کے زخم اور رمضان کا سبق
- جنگ کے بعد دُنیا نیا جنم لے گی!
- مکاشفاتِ اقبال: قیامِ پاکستان اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ
- امتحان و آزمائش (۲)

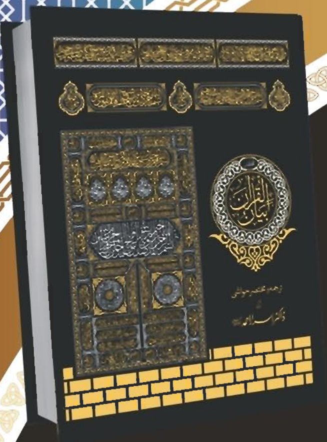

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت
کے بعد اب پیش ہے:

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

مختصر
بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی

- مضبوط جلد
- دیدہ زیب ٹائٹل
- 1248 صفحات

- ڈیلکس ایڈیشن: ~~4500~~ کے بجائے 2200 روپے
- سٹینڈرڈ ایڈیشن: ~~2500~~ کے بجائے 1250 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org
0301-1115348

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ: ۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد	:	75
شمارہ	:	4
ذوالقعدہ		1447ھ
اپریل		2026ء
فی شمارہ	:	60 روپے
سالانہ زرِتعاون	:	600 روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدّین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلسِ ادارت
o رضاء الحق o ایوب بیگ مرزا
o خورشید انجم o وسیم احمد

معاون مدیران
o محمد خلیق o حافظ محمد زاہد

مکتبہ خُدّامُ القرآن لاہور، 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042) ، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور   طابع: رشید احمد چوہدری   مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ____ 5
غزہ سے کابل: اُمّت کے زخم اور رمضان کا سبق
رضاء الحق

درسِ قرآن ____ 8
سُوۡرَۃُ الۡبَقَرَۃ (۲)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منبر و محراب ____ 35
قرآن حکیم سے ہمارا تعلق
شجاع الدین شیخ

دعوتِ فکر ____ 45
فکرِ آخرت
اعجاز لطیف

ظروف و احوال ____ 57
جنگ کے بعد دُنیا نیا جنم لے گی!
ایوب بیگ مرزا

تذکیر و موعظت ____ 67
امتحان و آزمائش (۲)
شیخ ابوکلیم مقصود الحسن الفیضی

اقبالیات ____ 81
مکاشفاتِ اقبال: قیامِ پاکستان اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ
مظفر حسین

”ادارہ“ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزہ سے کابل: اُمّت کے زخم اور رمضان کا سبق

الحمدللہ‘ رمضان المبارک کا مہینہ اپنی خیر و برکت بکھیرتا ہوا ختم ہو چکا ہے۔ یہ گزشتہ برسوں سے کئی اعتبار سے مختلف رہا ہے۔ بیشتر اسلامی ممالک بشمول پاکستان میں مہنگائی اور کرنسی دباؤ کے باعث افطار وسحر کے اخراجات بڑھے ہیں۔ نوجوان نسل میں قرآن سے جڑنے کا رجحان پہلے سے زیادہ رہا ہے‘ جو بلاشبہ خوش آئند ہے۔ اعتکاف‘ رضا کارانہ خدمات اور فلاحی کاموں میں دلچسپی کا پہلو بھی نمایاں طور پر دیکھا گیا۔ انجمن ہائے خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارمز سے ملک بھر میں کم وبیش دو سو مقامات پر مکمل دورۂ ترجمہ قرآن یا خلاصۂ مضامین قرآن مکمل کیا گیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کی دیگر دینی تنظیموں نے بھی اپنے اپنے طور پر قرآن سرکلز اور سماجی خدمت کے پروگرام منظم انداز میں کیے ہیں جن کی تحسین کی جانی چاہیے۔ آن لائن تراویح‘ دروسِ قرآن اور سوشل میڈیا مہمات کا رجحان مزید بڑھا ہے۔ بیرونِ ملک مقیم مسلمان لائیو اسٹریمنگ کے ذریعے مکہ ومدینہ کی عبادات سے جڑ رہے ہیں‘ خصوصاً مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ سے۔ مسجد اقصیٰ میں بھی ہزاروں مسلمان مل کر خوف کے سائے میں نماز عشاء اور تراویح ادا کرتے رہے ہیں۔ تشدد کے چند واقعات بھی رپورٹ ہوئے مگر ماضی کے ظلم وستم کے مقابلے میں اُنہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

یہ وہ مثبت تبدیلی ہے جو واضح طور پر سامنے آئی ہے‘ جس پر ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر بہرحال ادا کرنا ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ دو ارب مسلمانوں میں سے چند لاکھ لوگوں کے اس جذبہ پر مطمئن ہو جانا دانش مندی کا تقاضا ہرگز نہیں۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ہر مسلمان ہی قرآن سے جڑ جائے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگلے چند سال میں کم از کم قرآن کے مہینے میں‘ ہی قرآن سے جڑنے والوں کی تعداد ضرور بڑھے گی‘ ان شاءاللہ!

رمضان المبارک کی ہر سحری اور افطاری میں غزہ اور فلسطین میں جاری کشیدگی اور انسانی

بحران نے مسلمانوں کو غم وتشویش میں مبتلا بھی کیے رکھا۔ یہ رمضان مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے بعض ممالک میں سیاسی اُتار چڑھاؤ کے حوالے سے بھی خاصا اہم رہا۔ اس نے مذہبی اجتماعات اور عوامی سرگرمیوں کو متاثر کیا ہے۔ بعض جگہوں پر سکیورٹی انتظامات سخت ہیں‘ جبکہ کچھ ممالک میں معاشی دباؤ نے سادگی کو بڑھایا ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ یہ رمضان عبادات کے ساتھ عالمی حالات پر گہری نظر‘ انسانی ہمدردی اور سماجی تعاون کے جذبے کے باعث پہلے سے زیادہ بیداری اور اجتماعی شعور کا حامل نظر آیا۔ دُعا ہے کہ یہ جذبہ رمضان المبارک کے بعد بھی برقرار رہے۔ آمین!

رمضان المبارک جیسے روحانی مہینے میں مسلمان دنیا بھر میں صبر‘ ایثار‘ ہمدردی اور اللہ کے حضور جواب دہی کا سبق سیکھتے ہیں۔ مساجد آباد ہوتی ہیں‘ آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں اور دل میں اصلاحِ نفس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ تبدیلی صرف فرد تک محدود رہ جاتی ہے یا اجتماعی زندگی میں بھی منتقل ہوتی ہے؟ رمضان ہمیں بھوک پیاس کا احساس دے کر مظلوم کی تکلیف سمجھنا سکھاتا ہے۔ اگر یہی جذبہ اجتماعی شعور میں بدل جائے تو یقیناً مسلم معاشرے عالمی سیاست کے محض تماشائی نہ رہیں بلکہ اخلاقی اور پھر عسکری قیادت کا کردار ادا کر سکیں۔ افسوس یہ ہے کہ عبادات کے بعد بھی ہماری سیاست مفادات کی اسیر‘ معیشت سودی دباؤ میں جکڑی اور معاشرت انتشار کا شکار رہتی ہے۔ گویا روحانی تربیت اور اجتماعی کردار کے درمیان ایک خلا موجود ہے۔ رمضان کے بعد کا اصل امتحان تو یہی ہے کہ کیا ہم اپنی ذاتی اصلاح کو نظام کی درستی سے جوڑتے ہیں یا نہیں! اگر روزہ ہمیں ضبطِ نفس سکھاتا ہے تو اسے قومی فیصلوں میں بھی جھلکنا چاہیے۔ عبادت اگر ہمیں اللہ کے سامنے جھکنا سکھاتی ہے تو ظلم کے سامنے کھڑے ہونے کا حوصلہ بھی اِسی سے پیدا ہونا چاہیے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں بعض لمحات ایسے نظر آتے ہیں جہاں محض سیاست نہیں بلکہ انسانیت خود کٹہرے میں کھڑی نظر آتی ہے۔ گزشتہ مہینوں میں فلسطین خصوصاً غزہ کی پٹی میں پیش آنے والے الم ناک واقعات نے عالمی ضمیر کی بیداری کے دعوؤں کو ایک بار پھر بے نقاب کر دیا ہے۔ انسانی حقوق‘ جمہوریت اور عالمی انصاف کے بلند بانگ دعوے کرنے والی طاقتیں اِس آزمائش میں جس طرح خاموش یا جانب دار دکھائی دی ہیں‘ اُس

نے موجودہ عالمی نظام کی اخلاقی بنیادوں پر سنگین سوالات اُٹھائے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ طاقت کے ایوانوں میں انصاف کا پیمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہا‘ مگر حالیہ بحران نے تو اِس عدمِ توازن کو انتہائی واضح کر دیا۔ ایک طرف شہری آبادیوں کی تباہی‘ بے گھر ہوتے خاندان اور ملبے تلے دبے خواب ہیں‘ تو دوسری طرف سفارتی بیانات اور سیاسی مصلحتیں۔ عالمی ادارے‘ خصوصاً اقوامِ متحدہ‘ جن سے مظلوم اقوام کو امیدیں وابستہ تھیں‘ عملی اقدام کے میدان میں کمزور دکھائی دیے ہیں۔ قراردادیں‘ اجلاس اور بیانات اپنی جگہ‘ مگر جب انصاف ہی طاقت کے تابع ہو جائے تو پھر بھلا قانون کی روح کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ اِس سارے منظرنامے میں اسرائیل کی پالیسیوں پر عالمی ردِّعمل کا تضاد بھی نمایاں رہا۔ بعض طاقتیں انسانی جانوں کے ضیاع کو محض ”سکیورٹی“ کے تناظر میں دیکھتی رہیں‘ جبکہ مظلوموں کی چیخیں سیاسی مفادات کے شور میں دبتی رہیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب دنیا کے عام انسان اور نوجوان نسل نے سوال اُٹھانا شروع کیا کہ کیا عالمی انصاف واقعی سب کے لیے یکساں ہے!

غزہ کا المیہ ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ محض احتجاجی بیانات یا وقتی جذبات کافی نہیں ہیں بلکہ ضرورت اِس امر کی ہے کہ مسلم دنیا علمی‘ معاشی اور سیاسی سطح پر خود انحصاری کی طرف بڑھے۔ جب تک داخلی استحکام‘ تعلیم‘ تحقیق اور اخلاقی قیادت کو ترجیح نہیں دی جائے گی‘ عالمی نظام میں عزت اور اثر پذیری کا خواب ادھورا ہی رہے گا۔ آج دنیا ایک نئے موڑ پر کھڑی ہے۔ عالمی طاقتوں کے مفادات بدل رہے ہیں اور نئے اتحاد تشکیل پا رہے ہیں۔ ایسے میں اُمّتِ مُسلمہ کے پاس صرف دو راستے ہیں: حالات کے بہاؤ میں بہتی رہے‘ یا پھر رمضان کی روحانی تربیت کو عملی حکمت میں بدل کر ایک باوقار‘ منصفانہ اور بااثر کردار ادا کرے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب ایمان‘ اخلاق اور بصیرت ایک جگہ جمع ہو جائیں تو کمزور قومیں بھی زمانے کا رخ موڑ دیتی ہیں۔

گزشتہ چند ہفتوں کے دوران میں پاک افغان تعلقات نہایت نازک موڑ پر پہنچ چکے ہیں‘ تاہم امید کی کرن کو ہر حال میں سامنے رکھنا چاہیے۔ امن کے امکانات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ تازہ ترین کشیدگی نے پاک افغان تعلقات کو ایک خطرناک سطح پر پہنچا دیا ہے۔ ضروری ہے کہ دونوں ممالک کے قائدین صورتِ حال کو طویل المدتی امن کے تناظر میں دیکھیں‘ نہ کہ اُن طاقتوں کا آلہ کار بنیں جو امن کا نعرہ لگا کر دنیا بھر میں جنگ کی آگ بھڑکا رہی ہیں۔ ✿✿

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۶)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

آیات ۱۷ تا ۲۰

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ
بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ
اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ
بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ
وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

دو تماثیل: دو آراء

زیرِ مطالعہ رکوع کی بقیہ چار آیات میں دو تماثیل آ رہی ہیں‘ ان کے بارے میں بھی دو آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ دونوں منافقین ہی سے متعلق ہیں‘ لیکن ان کے مختلف shades ہیں۔ ایک شخص نفاق کی آخری منزل کو پہنچ چکا ہے جبکہ ایک ابھی درمیان میں ہے‘ کچھ امکان ہے کہ واپس لوٹ آئے‘ رجوع کرے اور اپنے روگ کا مداوا اور علاج کر سکے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ پہلی تمثیل ان کُفّار کے بارے میں ہے جن کا پہلے رکوع کے آخر میں تذکرہ ہوا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا

يُؤْمِنُوْنَ ۝٦ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ
غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧﴾

گویا دو اقسام کے کفر کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ ایک کفر پہلے رکوع کی آخری دو آیات میں آیا ہے۔ دوسرا معناً تو کفر ہے لیکن دعویٰ ایمان کا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ
بِمُؤْمِنِيْنَ ۝٨﴾

حقیقت میں تو یہ بھی کفر ہے۔ گویا کفر کے ان دو shades یا دو درجوں کے لیے یہ دو تماثیل آئی ہیں۔ یہ دونوں آراء ہیں۔ زیادہ رجحان یہی ہے کہ یہ دو تماثیل نفاق ہی کے دو درجات کے لیے ہیں۔ نفاق کے وہ درجات کون سے ہیں' ان کا ایک مختصر سا خاکہ سامنے آ جانا چاہیے تاکہ ان دونوں تماثیل کی اصل حقیقت واضح ہو سکے۔

نفاق کی حقیقت اور درجات

سب سے پہلے تو یہ جان لیجیے کہ نفاق کا لفظ بنا کہاں سے ہے۔ اس کا مادہ ''ن ف ق'' ہے' اس سے دو لفظ ذہن میں رکھیے۔ نفق سرنگ کو کہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں قلعوں اور محلات میں سرنگیں بنتی تھیں کہ اندر موجود بادشاہ یا بڑی شخصیات کو اندیشہ ہوتا تھا اگر باہر سے کوئی غنیم محل یا قلعہ کا محاصرہ کر لے اور مقابلے کی کوئی صورت اور امکان باقی نہ رہے تو پھر زمین دوز راستہ ہونا چاہیے' جس سے نکل کر بھاگا جا سکے۔ محل یا قلعہ سے شروع ہو کر وہ زیر زمین سرنگ کہیں دُور جا کر بیابان میں نکلتی تھی' تاکہ اس راستے سے جان بچا کر یہ لوگ بھاگ جائیں۔ یہ ہے ''نفق'' یعنی سرنگ۔ اسی طرح گوہ کے بل کو ''نافقاء'' کہتے ہیں۔ گوہ ایک جانور ہے جس کا گوشت عرب میں کھایا جاتا ہے۔ وہ ایک زیرِ زمین بل یا بھٹ بنا کر رہتا ہے۔ اہلِ عرب شکاری کُتوں کے ذریعہ اس کا شکار کرتے ہیں۔ گوہ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی سمجھ دی ہے کہ وہ اپنے بل یا بھٹ کے دو دروازے رکھتا ہے' ایک اُدھر اور ایک اِدھر۔ اگر اُدھر سے کُتّا داخل ہو تو یہ اِدھر سے نکل کر بھاگ جائے اور اگر اسے اِدھر سے کوئی خطرہ ہو تو اُدھر سے نکل کر بھاگ جائے۔ ان دونوں الفاظ کی حقیقت کو سامنے

رکھیے۔ پیشِ نظر ہے تحفظِ ذات' اپنا بچاؤ' اپنی حفاظت۔ حُبِّ جان' حُبِّ دنیا' حُبِّ مال اور حُبِّ اہل و عیال۔

نفاق کے چار درجات ہیں' انہیں سمجھ لینا چاہیے۔ اگرچہ اس کے پہلے درجہ پر لفظ نفاق کا اطلاق صحیح نہیں ہے اس لیے کہ وہ ضعفِ ایمان کی ایک کیفیت ہے۔ فطرتِ انسانی خیر کو پسند کرتی ہے۔ اگر کسی کی فطرت میں ذرا سی بھی جان باقی ہے تو وہ خیر کی طرف لپکتی ہے۔ اس اعتبار سے بہت سے لوگ دین کو قبول کر لیتے ہیں' حق کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ بات اچھی' درست اور معقول ہے' دل کو لگتی ہے اور دل گواہی دیتا ہے کہ اسے قبول کر لیں تو قبول کر لیتے ہیں۔ البتہ سب لوگ ہمت اور عزیمت کے لحاظ سے برابر نہیں ہوتے۔ ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

کچھ لوگ جو باہمت اور صاحبِ عزیمت ہیں' وہ اس کیفیت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں کہ اب جو ہو سو ہو' ہمیں کوئی پروا نہیں۔ جو قربانی دینی پڑے' جو تکلیف آئے' جس امتحان میں سے گزرنا پڑے' جس کھائی میں کودنا پڑے وہ تیار ہیں۔ بقول فیض ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی!
خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

یہ ایک کردار ہے۔ دوسرا کردار ان لوگوں کا ہے جن میں ہمت کی کمی ہے' عزیمت نہیں ہے۔ چلنا چاہتے ہیں لیکن ہمت اور حوصلہ ساتھ نہیں دے رہا۔ جب امتحان و آزمائش کا وقت آتا ہے تو ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں' اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں' خللِ اعصاب (neurasthenia) کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کیفیت کو قرآن نے مرض یا روگ کہا ہے۔ جیسا کہ جسمانی اعتبار سے سب لوگ برابر نہیں ہیں' کچھ قوی اور کچھ ضعیف ہیں' اسی طرح انسانی قوتِ ارادی کے اعتبار سے معنوی

حیثیت میں قویٔ الہمت اور اولوالعزم لوگ بھی ہیں‘ ضعیف الہمت اور ضعیف الارادہ لوگ بھی ہیں۔ ان لوگوں کو کبھی کوئی مسئلہ پیش آیا تو وہ پیچھے رہ گئے یا جو تقاضا آیا اس کو قبول نہ کر سکے۔ تاہم وہ مانتے رہے کہ ہم سے کمزوری ہوئی ہے‘ ہم ہمت نہ کر سکے‘ کوتاہی اور تقصیر ہوئی ہے۔ اگر اس کا اعتراف ہو رہا ہو تو یہ نفاق نہیں ہے‘ یہ ضعفِ ایمان کی ایک کیفیت ہے۔ البتہ انسان کی طبیعت کا ایک تقاضا ہے عزّتِ نفس (واضح رہے کہ مَیں طبیعت کا لفظ استعمال کر رہا ہوں‘ فطرت کا نہیں)۔ سورۃ البقرہ ہی میں ہم پڑھیں گے:

﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ (البقرۃ:۲۰۶)

’’اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو‘ تو جھوٹی عزّتِ نفس اس کو گناہ پر اور جما دیتی ہے۔‘‘

یعنی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کی غلطی کو اگر اس کے سامنے بیان کیا جائے‘ اس کو متنبہ کیا جائے اور اُسے کہا جائے کہ اللہ کا خوف کرو‘ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو‘ مانو کہ تم سے یہ غلطی ہوئی ہے تو اس کی جھوٹی اَنا اور عزّتِ نفس اس کو قابو میں کر لیتی ہے۔ وہ اپنی بات کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کی عزّتِ نفس اور جھوٹی اَنانیت اسے گناہ پر جما دیتی ہے۔ یہ کیفیت طبعِ انسانی کا تقاضا ہے۔ جب انسان بار بار یہ کہتا ہے کہ مجھ سے خطا ہوئی‘ غلطی ہوئی‘ مَیں تسلیم کرتا ہوں‘ تو ایک وقت دماغ میں آتا ہے کہ کیوں نہ جھوٹا بہانہ بنا لیا جائے۔ پھر وہ کہتا ہے: اجی ایسی بات نہیں ہے‘ مَیں تو چلنے کو تیار تھا لیکن عین وقت پر یہ معاملہ پیش آ گیا‘ اس میں میری کوئی تقصیر اور غلطی نہیں‘ بلکہ یہ تو ایک حادثہ تھا جو سرزد ہو گیا۔ یہاں سے اب نفاق کا آغاز ہوتا ہے۔

دراصل جھوٹ اور نفاق کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ سورۃ المنافقون کی پہلی آیت میں بھی منافقین کو کاذبون (جھوٹے) قرار دیا گیا ہے:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾

’’(اے نبی ﷺ!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم

گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اُس کے رسول ہیں۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔‘‘

اس سے پہلے جو آیات ہم پڑھ چکے ہیں‘ ان میں بھی یہ لفظ (کذب) آ چکا ہے: ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰﴾ ’’اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بسبب اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے یا جھوٹ کہتے رہے۔‘‘ گویا جھوٹ اور نفاق لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں جھوٹے بہانے بنانے شروع کر دیے تو وہاں سے نفاق کی پہلی منزل شروع ہو گئی۔

دوسری منزل یہ ہے کہ جب انسان متواتر جھوٹے بہانے بناتا رہے تو خود اس کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ کچھ لوگ میری بات پر زیرِ لب مسکراتے ہیں‘ میرا جھوٹ ان پر کھل چکا ہے۔ اب وہ اپنے اس بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے جھوٹی قسم کھاتا ہے کہ مَیں جو کہہ رہا ہوں یہ صحیح ہے‘ واقعتاً یہ مجبوری تھی‘ میرے لیے یہ مشکل پیش آ گئی تھی۔ اس طرح قسمیں کھا کھا کر پھر وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کیفیت بھی سورۃ المنافقون میں موجود ہے: ﴿اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ (آیت ۲) ’’انہوں نے اپنی قسموں کو اپنی ڈھال بنا لیا ہے۔‘‘ لوگوں کی طرف سے اعتراضات آ رہے ہوں کہ بھئی تمہیں کیا ہوا‘ کیا بات ہے فلاں موقع پر تم نظر نہیں آئے‘ دین کے لیے بڑا اہم موقع تھا‘ اس دعوت و تحریک کے لیے بہت فیصلہ کن مرحلہ تھا‘ تم اس وقت کہیں دبک گئے‘ نظر نہیں آئے‘ تو وہ جھوٹی قسموں کو ڈھال بنائیں گے۔ ان اعتراضات اور نظمِ جماعت کے حوالے سے جو جواب طلبیاں ہوتی ہیں‘ ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے وہ اپنی قسموں کو ڈھال بناتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۴﴾ (المجادلۃ)

’’کیا تم نے غور نہیں کیا اُن لوگوں (کے طرزِ عمل) پر جنہوں نے دوستی گانٹھی ہے اُن لوگوں سے جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔ نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ اُن میں

سے ہیں‘ اور وہ جانتے بوجھتے جھوٹ پر قسمیں اٹھاتے ہیں۔‘‘

وہ جان بوجھ کر جھوٹ پر حلف اٹھاتے ہیں‘ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ گویا یہ اس مرضِ نفاق کی دوسری سٹیج ہے۔ مَیں نے ابتدائی مرحلے کو نفاق نہیں بلکہ ضعفِ ایمان کی کیفیت کہا ہے۔ نفاق کا آغاز جھوٹے بہانے سے ہوتا ہے۔

دین کا تحریکی تصوّر

تعارفِ قرآن کے ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ انہوں نے ’’تفہیم القرآن‘‘ کے مقدمے میں یہ بہت قیمتی بات تحریر کی ہے کہ قرآن مجید کے بہت سے حقائق اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک کہ دین کا تحریکی تصور سامنے نہ ہو۔ چنانچہ اگر دین کا جامد تصور ذہن میں ہے تو نفاق کی حقیقت کبھی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ نفاق کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے حرکت وتحریک اور انقلابی جِدّ وجُہد میں۔ جہاں تقاضا اور مطالبہ آتا ہے‘ جان و مال کی قربانی کے مواقع آتے ہیں‘ وہاں ایمان اور نفاق ظاہر ہو جاتے ہیں۔ وگرنہ جو شخص اس جدّ وجُہد میں ہے ہی نہیں‘ نماز و روزہ اور کچھ دیگر رسومات پر عمل کرنے ہی کو دین سمجھے بیٹھا ہے‘ اس پر کہاں آزمائش آئے گی؟ اس پر اس طرح کے کوئی مراحل آئیں گے ہی نہیں۔ نفاق کی حقیقت تب سمجھ میں آتی ہے جب آپ کے پس منظر میں کوئی حرکت یا جِدّ وجُہد ہو جو مختلف مراحل سے گزری ہو۔ مکّہ میں عدمِ تشدد اور صبرِ محض (passive resistance) کا بھی ایک دور تھا‘ جبکہ مدینہ میں اِقدام (active resistance) کا دور شروع ہوا۔ اب حکم ہوا کہ اللہ کے راستے میں نکلو:

﴿وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ﴾ (البقرۃ:۱۹۰)

’’اور قتال کرو اللہ کی راہ میں اُن سے جو تم سے قتال کر رہے ہیں۔‘‘

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَا لَکُمۡ اِذَا قِیۡلَ لَکُمُ انۡفِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اثَّاقَلۡتُمۡ اِلَی الۡاَرۡضِ ؕ﴾ (التوبۃ:۳۸)

’’اے ایمان کے دعوے دارو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ نکلو اللہ کی راہ میں تو تم دھنسے جاتے ہو زمین کی طرف!‘‘

جس کو ہم کہتے ہیں کہ پاؤں مَن مَن بھر کے ہو جاتے ہیں‘ حرکت میں نہیں آسکتے‘ جنبش نہیں کرتے۔ تم جامد وساکت ہو کر رہ جاتے ہو۔ یہ تب سمجھ میں آئے گا جب دین کا dynamic concept‘ دعوت وتحریک سامنے ہو۔ تب سارے حقائق واضح اور اُجاگر ہوں گے۔ اگر تحریکی تصور نہیں اور مذہب کا محض جامد تصور ہے تو یہ مسائل سمجھ میں آئیں گے ہی نہیں۔

نفاق کا آخری درجہ

اس اعتبار سے مَیں نے عرض کیا‘ جہاں جھوٹا بہانہ شروع ہوا تو یہ نفاق کی پہلی سٹیج ہے۔ اگلی سٹیج ہے جھوٹی قسمیں ﴿یَحۡلِفُوۡنَ عَلَی الۡکَذِبِ﴾۔ اس کے بعد سخت جھنجھلاہٹ کی سٹیج ہے۔ مخلص لوگوں سے بغض پیدا ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ہمیں کن مصیبتوں میں ڈال دیا۔ ہمیں یہ پریشانیاں ان کی وجہ سے آرہی ہیں۔ ہم تو کہہ رہے ہیں کہ مصلحت کو دیکھو‘ مصالحت کر لو۔ خواہ مخواہ aggressive ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ خواہ مخواہ آگے بڑھ کر کشمکش اور کشاکش کا آغاز کر دینا کیا ضروری ہے؟ اگر مدِمقابل اپنے باطل پر قائم ہیں تو قائم رہیں‘ ہم اپنے حق کو لے کر چلیں اور آگے بڑھیں۔ ’’اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ‘‘ ہمارے مابین کوئی co-existence ہونی چاہیے‘ کوئی مصالحت ہونی چاہیے۔

یہ بیان ہو چکا کہ قرآن کی رُو سے اصلاح اور فساد دونوں کا اصل نظریہ کیا ہے! اگر کہیں پر اللہ کا دین غالب نہیں ہے‘ اللہ کا نظام قائم نہیں ہے تو بظاہر کتنا ہی امن ہو وہ اصلاح نہیں بلکہ فساد ہے۔ اس کے لیے جو جِدّ وجُہد کی جائے گی وہ اصلاح ہے‘ اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے تو وہ اِفساد ہے یعنی وہ مفسدین کا کردار ہے۔ یہ ہے وہ بغض‘ جس کی مثال یہ ہے کہ جس بلی کی دُم کٹی ہو‘ وہ چاہتی ہے کہ سب کی دُمیں کٹ جائیں۔ لہٰذا منافقین یہ چاہتے تھے کہ کوئی بھی آگے نہ بڑھے۔

جب کچھ لوگ call of duty پر لبیک کہتے ہیں‘ تو جو پیچھے رہ گئے وہ نمایاں ہو گئے۔ اگر سب بیٹھے رہتے تو برابر تھے۔ لہٰذا آگے بڑھ جانے والوں سے ایک بغض اور دشمنی پیدا ہو گئی کہ ان پر کوئی مصیبت آئے تو اچھا ہے‘ یہ بہت ہی زیادہ جری

(adventurous) ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر بہت ہی زیادہ جسارتیں آ گئی ہیں۔ اچھا ہے اگر انہیں کوئی سزا ملے‘ تاکہ ان کو ہوش آئے اور یہ اپنے معاملات میں کچھ میانہ روی اختیار کریں۔ یہ بغض‘ دشمنی اور شقاق دراصل نفاق کا آخری درجہ ہے جس پر جا کر انسان اسی سٹیج پر پہنچ جاتا ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۷﴾

یہ چار stages سامنے رکھیں اور اب ذرا ان دو تماثیل پر غور کریں:

آیت ۱۷ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ ۱۷ ’’ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ روشن کی۔ پھر جب اُس آگ نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر لیا اور چھوڑ دیا ان کو اندھیروں کے اندر کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔‘‘

ان کا معاملہ اس شخص کی کیفیت کے مشابہ ہے یا ان کی مثال اس شخص کی مانند ہے۔ مثال کہتے ہیں کہ کسی چیز کے اندر کوئی مشابہت ہو۔ تشبیہ اور تمثیل میں فرق ہے۔ تشبیہ مفرد ہوتی ہے کہ ایک شے کو دوسری شے سے تشبیہ دے دی جائے‘ اس میں مطابقت ضروری ہے۔ تمثیل مرکب تشبیہ ہوتی ہے کہ ایک صورت حال (situation) کو دوسری کے مقابل رکھ دیا جائے۔ اس میں تمام اجزاء کی مطابقت لازم نہیں ہوتی بلکہ اس کا ’sum total مجموعی اثر (effect) مشابہ ہو جانا چاہیے۔ مشبّہ لہٗ جس کے لیے تشبیہ دی جا رہی ہے‘ اس کے ساتھ بحیثیت مجموعی مشابہت ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مشبّہ بہٖ اور مشبّہ لہٗ کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح مطابقت رکھتے ہوں۔ تمثیل اور تشبیہ کے فرق کو ذہن میں رکھیں تو اس سے ایک مجموعی situation کا تصور سامنے آتا ہے‘ اس میں ان کی باطنی کیفیت کے ساتھ مشابہت ہے۔

پہلی تمثیل: نورِ رسالت کے باوجود گمراہی میں مبتلا ہونا

ان کی مثال یا ان کی مشابہت اس شخص کی کیفیت کے مشابہ ہے جس نے آگ روشن کی۔ ’’وَقُود‘‘ ایندھن کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد بار آیا ہے۔ جہنم کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (البقرۃ:۲۴) کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ ایندھن طلب کرنا تاکہ اس سے آگ روشن کی جائے‘ آگ جلائی جائے‘ یہ ہے استیقاد (باب استفعال)۔ وہ لفظ یہاں پر آیا ہے: اسْتَوْقَدَ۔ فرمایا کہ ان کی مثال اس شخص کی کیفیت کے مانند ہے جس نے آگ روشن کی۔ نار عربی میں مؤنث ہے‘ تو یہاں ’’اَضَآءَتْ‘‘ مؤنث کا صیغہ آیا ہے۔ ﴿فَلَمَّاۤ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ﴾ ’’تو جب اس آگ نے روشن کر دیا اس کے ماحول کو‘‘ یعنی جب اردگرد روشن ہو گیا ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ ’’تو اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر لیا‘‘۔ اللہ ان کی بینائی لے گیا ﴿وَتَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ ۱۷﴾ ’’اور چھوڑ دیا ان کو اندھیروں میں کہ یہ کچھ نہیں دیکھتے‘‘۔

اس تمثیل میں یہ نقشہ کھینچا جا رہا ہے کہ کوئی قافلہ رات کو کہیں راستہ سے بھٹک گیا ہے‘ رات بہت اندھیری اور تاریک ہے‘ راستہ نظر نہیں آ رہا کہ کدھر جائیں۔ اس کیفیت کو ذرا چشمِ تصوّر سے دیکھیے کہ ایسے میں کوئی باہمت شخص اٹھتا ہے اور اِدھر اُدھر سے ٹٹول کر ایندھن جمع کرتا ہے۔ اندھیرے میں بڑے خطرات ہوتے ہیں کہ کہیں کوئی لکڑی سمجھ کر سانپ پر نہ ہاتھ ڈال دے۔ بہرحال کسی باہمت آدمی نے ساری محنت کی‘ ایندھن جمع کیا اور اُس میں آگ لگا دی جس نے ماحول کو روشن کر دیا۔ پہلے سب لوگوں کی بینائی سلامت تھی‘ لیکن باہر روشنی نہ ہونے کے باعث کچھ دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ اب صورت تبدیل ہو گئی کہ ماحول روشن ہو گیا۔ پھر اچانک یہ حادثہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کی بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ وہ تو جوں کے توں اندھیرے میں رہ گئے‘ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ پہلے ماحول تاریک تھا اور اپنی بصارت موجود تھی‘ لیکن نتیجہ یہ تھا کہ دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ اب اگرچہ ماحول منور ہو گیا ہے مگر اپنی بصارت سلب ہو گئی تو اس کے نتیجہ میں اندھے کے اندھے ہی

رہے‘ کچھ نظر نہیں آ رہا۔ انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔

اس تمثیل میں مَا حَوْلَہٗ سے مراد درحقیقت نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے قبل کے اندھیرے ہیں جن میں قافلہ انسانی بھٹک رہا تھا۔ اگرچہ بہت سے لوگ ایسے تھے کہ جو کسی درجے میں توحید تک بھی پہنچ گئے‘ آخرت اور معاد کا تصور بھی حاصل ہو گیا‘ لیکن لائحہ عمل کا کوئی تصور ان کے سامنے نہیں تھا۔ جیسے حضرت زید بن عمرو بن نفیل جو حضرت سعید بن زید ؓ (یکے از عشرہ مبشرہ) کے والد ہیں‘ کعبے کے پردے پکڑ پکڑ کر کہتے تھے: اے اللہ! مَیں صرف تجھے پوجنا چاہتا ہوں‘ لیکن کیسے پوجوں‘ کیا کروں‘ مجھے یہ معلوم نہیں! اس ماحول میں محمد رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہوا۔ آپؐ نے ماحول کو منور کر دیا‘ اب راستہ نظر آ رہا ہے۔ آفتابِ رسالت طلوع ہو چکا ہے‘ لیکن کچھ لوگوں کی بینائی حسد اور بغض کی وجہ سے سلب ہو گئی۔ لہٰذا وہ اب اندھیروں کے اندر ہی بھٹک رہے ہیں۔ اگرچہ آفتابِ رسالت نصف النہار پر چمک رہا ہے‘ لیکن ان کی قوتِ بصارت اپنے حسد‘ تکبر اور انانیت کی وجہ سے سلب ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب یہ بھٹکتے رہیں گے۔

آیت ۱۸ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ ”یہ بہرے ہیں‘ گونگے ہیں‘ اندھے ہیں‘ سو اَب یہ نہیں لوٹیں گے۔“

صُمٌّ ”اَصَمّ“ کی جمع ہے یعنی بہرا‘ بُکْمٌ ”اَبْکَم“ کی جمع ہے یعنی گونگا اور عُمْیٌ ”اَعْمٰی“ کی جمع ہے یعنی اندھا۔ فرمایا کہ یہ تو بہرے‘ گونگے اور اندھے ہیں‘ یہ لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں۔

ان دو آیات میں مذکور تمثیل کے ضمن میں میرے نزدیک وہ رائے قوی ہے کہ یہ انہی کُفّار کے بارے میں ہے جن کا ذکر پہلے رکوع کے آخر میں آیا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫﴾۔ یہاں تین چیزیں مذکور ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں۔ البتہ جو شخص نفاق کی بھی آخری حد کو پہنچ گیا ہو جو مَیں نے چوتھی منزل بیان کی ہے‘ اس پر بھی اس کا اطلاق ہو گا۔ ضعفِ ایمان کے مرض کو بھی اس میں شامل کر لیں کہ نفاق کا نقطۂ آغاز

(starting point) تو وہی ہے۔ انسان اگر جسمانی طور پر کسی وجہ سے کمزور ہو گیا ہو‘ اس کی قوتِ مدافعت کم ہو گئی ہو تو اس پر ہر طرح کے جراثیم حملہ آور ہو جائیں گے۔ اسی طرح نفاق کے جراثیم اس وقت تک حملہ آور نہیں ہو سکتے جب تک کہ ایمان میں ضعف نہ آ گیا ہو۔ اگر ایمان قوی ہے تو نفاق اس کا نقیض ہے‘ وہ تو اس کے قریب بھی پھٹک نہیں سکتا۔ جب ضعفِ ایمان کی کیفیت ہوتی ہے تو نفاق کے حملہ آور ہونے کا امکان ہے۔ اس طرح نفاق کی چار stages ہو گئیں۔ فائنل سٹیج پر پہنچا ہوا شخص چاہے کھلم کھلا کفر اور ارتداد کا اعلان نہیں کر رہا‘ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل کر رہا ہے‘ لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ کفر کے اس درجے کو پہنچ چکا ہے جو point of no return ہے۔ اس کے لیے پہلے الفاظ آئے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫﴾ اور یہاں الفاظ آئے: ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾

یہ ایک تمثیل ہے جو دونوں کے لیے ہے‘ اور میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ کُفّار کے لیے ہے۔ اب دوسری تمثیل ملاحظہ کیجیے:

آیت ۱۹ ﴿اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ”یا اُن کی مثال ایسی ہے جیسے بڑے زور کی بارش برس رہی ہے آسمان سے‘ اُس میں اندھیرے بھی ہیں اور گرج اور بجلی (کی چمک) بھی۔ یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں کے اندر ٹھونسے لیتے ہیں مارے کڑک کے‘ موت کے ڈر سے۔ اور اللہ ایسے کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔“

سماء کا مادہ ہے س م و۔ ”سمو“ بلندی کو کہتے ہیں۔ عرب میں کہا جاتا ہے صاحبِ سموٗ عالی جناب‘ عالی مرتبت۔ یہ لفظ سماء علو یا بلندی کے لیے ہے۔ اب یہ کہ سات آسمان کیا ہیں‘ ان کی حقیقت کیا ہے‘ یہاں اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ بارش برستی

ہے اوپر سے‘ بلندی سے۔ صَیِّب کا لفظ اصلاً تو ایسے بادلوں کے لیے آتا ہے جن کے اندر بھرپور پانی اور بارش کی صلاحیت موجود ہو‘ لیکن اس کا اطلاق مجازاً بارش پر بھی ہوتا ہے۔ بڑی زوردار بارش ہے۔ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ ’’اس میں اندھیرے بھی ہیں‘‘ وَّرَعْدٌ ’’اور کڑک ہے‘‘ وَّبَرْقٌ ’’اور بجلی چمک رہی ہے۔‘‘ یعنی ایک طوفانی کیفیت ہے۔ یہاں بھی یوں سمجھیے کہ ایک قافلہ کسی اندھیری شب میں ایک طوفان میں گھر گیا ہے۔ زوردار بارش اور کڑک ہے۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی ہے‘ تو لمحہ بھر کے لیے دائیں بائیں کچھ نظر آتا ہے کہ ادھر درخت ہیں‘ پہاڑ ہے‘ سبزہ ہے‘ اگلے ہی لمحے پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس پوری تصویر کو بحیثیت مجموعی ذہن میں رکھیے۔

’’صَاعِقَه‘‘[1] ایک بہت بڑی کڑک کو کہتے ہیں‘ جس کی جمع صَوَاعِق ہے۔ صَعِقَ (س) صَعَقًا کا معنی ہے زور سے بادل گرجنا۔ کسی بڑی کڑک کی وجہ سے انسان بے ہوش ہو جائے تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ الاعراف (آیت ۱۴۳) میں آیا ہے: ﴿وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾۔ ’’مِّنَ الصَّوَاعِقِ‘‘ کڑک اور گرج سے ’’حَذَرَ الْمَوْتِ‘‘ موت کے خوف سے۔ صورِ اسرافیل پھونکا جائے گا تو قیامت آئے گی۔ وہ ایک آواز ہی تو ہے‘ کھڑکھڑانے والی آواز: ﴿اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝﴾ یہ آواز ہی ہلاکت وتباہی کا ذریعہ بنے گی۔ تو بجلی کی کڑک کی وجہ سے ان کو جان کا خوف لاحق ہو گیا اور اس کی وجہ سے یہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ہوئے ہیں۔ ﴿وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝١٩﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ ان کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے نکلنے والا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ موت کا وقت آ گیا تو وہ

(۱) ’’الصَّاعِقَة‘‘ کا لفظ قرآن کریم میں چھ دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ زوردار آواز کے ذریعے عذاب کے حوالے سے آیا ہے۔ سورۂ حٰم السجدة میں ارشاد ہوا: ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝١٣﴾ ’’تو (اے نبیﷺ!) اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ مَیں نے تو تمہیں خبردار کر دیا ہے ایک ایسی خوف ناک کڑک سے جیسی کہ قومِ عاد اور قومِ ثمود کی کڑک تھی۔‘‘ (حاشیہ از مرتب)

آ کر رہے گی‘ چاہے کانوں میں کتنی ہی انگلیاں ٹھونسی ہوں۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ یہ بھی درحقیقت بزدلی کی ایک کیفیت ہے‘ ضعفِ ارادہ ہی کی ایک کیفیت ہے کہ جس کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے کہ کانوں میں خوف سے انگلیاں ٹھونسے تھرتھر کانپ رہے ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٠﴾ ’’قریب ہے کہ بجلی اُچک لے ان کی آنکھیں۔ جب چمکتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں‘ اور جب ان پر تاریکی طاری ہو جاتی ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اور اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت کو سلب کر لیتا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی بصارت اُچک لے جائے‘ لیکن ابھی ایسا ہوا نہیں ہے۔ یہ درمیانی مرحلے کی بات ہو رہی ہے جبکہ ابھی بینائی سلب نہیں ہوئی۔ ویسے اللہ جب چاہے ان کی بینائی سلب کر لے‘ لیکن اس وقت تک کیفیت یہ ہے کہ بینائی سلب نہیں ہوئی۔ جب بھی اس برق کی وجہ سے روشنی ہوتی ہے تو اس میں کچھ چل پھر لیتے ہیں‘ کچھ آگے بڑھ لیتے ہیں‘ کچھ حرکت ہو جاتی ہے۔ اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کی بصارت اور سماعت سلب کر لے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ لیکن اللہ کی سُنّت یہ نہیں ہے کہ جو اس کیفیت میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں‘ نیمے دروں نیمے بروں‘ ان کو زبردستی ہدایت پر لے آئے یا زبردستی گمراہی کی طرف دھکیل دے‘ بلکہ انہیں ان کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیتا ہے۔

دوسری تمثیل: ضعفِ ایمان کی کیفیت

اس تمثیل کے اندر کچھ کمزور‘ کم ہمت‘ بزدل اور ضعفِ ارادہ کے مریض افراد کا نقشہ کھینچا گیا ہے‘ اور جیسا کہ مولانا مودودیؒ کا حوالہ دیا گیا کہ تحریک‘ دعوت اور حرکت بالخصوص انقلابی دعوت‘ اس میں قدم قدم پر آزمائشیں‘ امتحانات‘ ابتلائیں ہیں‘ جان و مال

کھپانے کا مطالبہ ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو‘ قربانیاں دو‘ اپنا وقت صرف کرو۔ وقت بھی دولت ہے (time is money) اور جب آدمی سے وقت کا تقاضا کیا جاتا ہے تو وہ اس پر گراں اور شاق گزرتا ہے۔ جس وقت میں اہل وعیال اور گھریلو معاملات پر توجہ ہوسکتی تھی وہی وقت انسان اگر دعوت وتحریک کے لیے لگا رہا ہے تو گھر میں بھی بے چینی اور شکوہ وشکایت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک اور امتحان ہے کہ جس سے انسان دوچار ہوتا ہے۔ جو عزمِ مصمّم کے ساتھ یکسو ہو کر چل رہا ہے‘ اسے کسی چیز کا ڈر اور خوف نہیں۔ جو ہونا ہے ہو جائے‘ کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے‘ کسی سے کٹنا پڑتا ہے تو کٹ جائے۔ تکلیف آئے تو جھیل لے‘ صبر ومصابرت کی روش اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ پھر وہی مشکلات جو شروع میں پہاڑ کی طرح نظر آتی تھیں‘ رفتہ رفتہ آسانیوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ اللہ کی طرف سے ”تیسیر“ اسی کو کہتے ہیں: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷﴾ ”تو ہم اس کے لیے آسانیاں پیدا کرتے چلے جائیں گے۔“ دوسروں کو نظر آئے گا کہ یہ بات تو بڑی مشکل تھی‘ بڑا کٹھن مرحلہ تھا‘ اس نے یہ کیسے عبور کرلیا!

میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی مثال غزوۂ بدر کی ہے کہ جہاں معاذ اور معوذ (رضی اللہ عنہما) دونوجوان انصاری صحابیوں نے ابوجہل کو قتل کیا۔ ان میں سے ایک کے بارے میں یہ روایت ہے کہ ان کے ایک شانے پر تلوار کا اتنا کاری وار پڑا کہ پورا بازو کٹ گیا‘ ایک تسمہ سا لگا رہ گیا۔ یعنی ہاتھ بے کار ہو چکا ہے لیکن لٹکنے کی وجہ سے اُلجھن پیدا کر رہا ہے۔ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے بھی آزادانہ طور پر کوئی کام نہیں کر پا رہے‘ اس لیے کہ ایک ہاتھ لٹکا ہوا ہے‘ جس پر کنٹرول نہیں‘ اور یہ پریشان کر رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس ہاتھ کو اپنے پاؤں تلے رکھا اور جھٹکا دے کر اُسے اتار کر پھینک دیا کہ یہ رکاوٹ بن رہا تھا۔ یہ سن کر جھرجھری آتی ہے کہ انسان ایسا بھی کرسکتا ہے! جب کسی چیز کی لگن اور دھن انسان کے سر پر سوار ہوجائے تو یہ چیزیں بڑی آسان ہوجاتی ہیں۔ دیکھنے والوں پر لرزہ طاری ہوگا۔ وہ سوچیں گے کہ ایسے ایسے کٹھن مراحل سے یہ لوگ کیسے گزر رہے ہیں! شاید

کچھ لوگوں کو محسوس ہو رہا ہو کہ یہ کوئی بڑا ہی سیدھا اور ہموار راستہ ہے جس پر وہ بڑھ رہے ہیں۔ اسی جِدّوجُہد میں جن کے اندر ہمت نہیں‘ کمزوری اور ضعف ہے‘ قوتِ ارادی مضمحل ہے‘ وہ قدم قدم پر رکیں گے‘ ٹھٹک جائیں گے۔

مدنی دور میں بھی جنگوں کے مابین وقفے آتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے حالات میں کچھ نہ کچھ ٹھہراؤ آ جاتا تھا‘ لیکن ہر وقت اندیشے رہتے تھے‘ خوف کی حالت طاری رہتی تھی۔ اس لیے کہ مدینہ میں آباد یہود کے قبائل سازشیں کر رہے تھے۔ دوسری طرف بھی سازشیں ہو رہی تھیں۔ مکّہ سے خبریں آ رہی تھیں کہ یہ یہ مشورے طے پا رہے ہیں۔ حالتِ خوف تو تھی‘ لیکن بہرحال درمیان میں انہیں کچھ نہ کچھ ریلیف کا وقفہ مل جاتا تھا۔ ایسی حالت میں وہ کچھ آگے چل لیتے تھے‘ کچھ آگے بڑھتے تھے تاکہ نمایاں ہو جائیں۔ مسجد نبوی میں بھی اگلی صف میں آ کر بیٹھتے تھے تاکہ معلوم ہو کہ یہ لوگ بھی ایمان واسلام میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ شریک ہیں اور ان کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ﴿كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ﴾ یہ گویا ایک کیفیت ہے کہ جیسے ہی ذرا کوئی روشنی ہوتی ہے تو چل لیتے ہیں‘ کچھ لوگوں کی معیت میں اپنا بھی ثبوت دیتے ہیں کہ ہم بھی ساتھ ہیں۔ جیسے سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۰ میں ان کی کیفیت بیان کی گئی کہ یہ لوگ ایمان تو لائے ہیں مگر اس راستے کی مشکلات اور آزمائشوں کو جھیلنے کا ان میں حوصلہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کھول کر واضح کر دے گا‘ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دے گا‘ بالکل واضح ہو جائے گا کہ کون واقعی مؤمن ہے اور کون منافق ہے۔

اسی کیفیت کو سورۃ الحج میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰي حَرْفٍ ۚ﴾ (آیت ۱۱) کہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی بندگی تو کرنا چاہتے ہیں‘ لیکن کنارے کنارے رہ کر۔ منجدھار میں کودنے کو تیار نہیں۔ اس لیے کہ فطرت تو کشش محسوس کرتی ہے کہ بات صحیح ہے‘ تسلیم کرو۔ آؤ شامل ہو جاؤ‘ اچھے لوگ ہیں‘ اچھا قافلہ ہے۔ پھر اگر خیر ملے تو مطمئن ہوتے ہیں‘ ساتھ چل رہے ہوتے ہیں کہ صرف نماز روزے ہی کی بات ہے۔ نماز کے لیے کسل مندی تو ہوتی تھی‘ لیکن بہرحال کوئی ایسی

قربانی والی بات تو نہیں تھی‘ جان اور مال پر آنچ تو نہیں آتی تھی‘ بس تھوڑی سی مشقت ہی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو عبداللہ بن اُبی اپنی چودھراہٹ کے مظاہرے کے لیے بڑے اہتمام کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا کہ مَیں یہاں کا سردار ہوں۔ یہ وہی شخص ہے کہ جب حضور ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اس نے کہا تھا کہ میرے گھر چلیے‘ وہاں قیام پذیر ہوں‘ اس لیے کہ مدینہ میں سب سے بڑا اور آرام دہ گھر میرا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری اونٹنی کو چھوڑ دو‘ اللہ کی طرف سے اسے جہاں حکم ہوگا وہاں یہ رک جائے گی‘ اور وہیں میرا قیام ہوگا۔ بہرحال اس نے اپنی چودھراہٹ کے اظہار کا ایک ذریعہ یہ بھی اختیار کیا کہ ہر خطبہ سے پہلے کھڑا ہو کر کہتا تھا: لوگو! دیکھو یہ اللہ کے رسول ہیں‘ ان کی بات بڑی توجہ سے سنو۔ بہرحال ایسے لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ جب کوئی مطالبہ نہیں‘ قربانی نہیں‘ کوئی مشکل اور آزمائش نہیں تو اُچھلتے پھرتے تھے۔

پھر جب تاریکی طاری ہوگئی‘ اندھیرا چھا گیا‘ مصائب‘ مشکلات‘ تکالیف‘ امتحانات‘ تقاضے اور مطالبے آ گئے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے‘ جس کو ہم کہتے ہیں ٹھٹک کر کھڑے ہو جانا۔ فرمایا کہ اللہ چاہتا تو ان کی سماعتوں اور بصارتوں کو سلب کر لیتا‘ جیسے کہ پہلے لوگوں کے ساتھ کیا کہ اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے‘ لیکن اس کا قانون یہ نہیں ہے کہ کسی کو زبردستی ہدایت دی جائے یا زبردستی گمراہ کر دیا جائے۔ جو جس حد تک خود جاتا ہے‘ وہیں تک وہ قانونِ خداوندی کی گرفت میں آئے گا۔ اس میں اس کا اپنا اختیار اور انتخاب (free choic e) برقرار رہے گا۔

اس اعتبار سے یہ دوسری تمثیل بنیادی طور پر ضعفِ ایمان کی کیفیت کی تشبیہ اور اس کی تمثیل ہے‘ جو نفاق کے ابتدائی درجے کو بھی cover کرتی ہے۔ البتہ نفاق کی آخری شکل اور کفر میں کوئی فرق نہیں۔ وہ تو بالکل کفر ہے‘ سوائے اس کے کہ جیسے کوئی بہت بڑا شہتیر یا کوئی چوکھٹ ہو‘ بظاہر موٹی لکڑی نظر آ رہی ہو‘ لیکن اندر سے اسے دیمک چٹ

کر چکی ہو۔ اس صورت میں اس پر صرف ایک چھلکا سا (veneer) لگا رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس چھوٹے سے کیڑے کو بھی اتنی سمجھ دی ہے کہ اگر یہ کیفیت باہر سے ظاہر ہو گئی اور ہم نے اس کی covering بھی ختم کر دی تو گھر والوں کو فوراً معلوم ہو جائے گا اور پھر وہ ہمارا بندوبست کر لیں گے۔ چنانچہ دیمک لکڑی کو چٹ کرتی جا رہی ہے‘ لیکن اوپر کا کور اس نے برقرار (intact) رکھا ہوا ہے۔ یہی معاملہ منافقین کا ہے کہ کفر کی آخری حد تک پہنچنے کے باوجود وہ اسلام کی ڈھال کے طور پر کلمہ شہادت‘ کچھ نہ کچھ نماز‘ روزہ دکھاوے اور ریاکاری کے لیے برقرار رکھتے تھے تاکہ مسلمان شمار کیے جائیں اور ان کا تعلق بھی ادھر سے ٹوٹنے نہ پائے۔ ورنہ حقیقت کے اعتبار سے ان کی کیفیت یہ تھی جو سورۃ المنافقون میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳﴾

’’یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے‘ تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی‘ پس یہ سمجھنے سے عاری ہو گئے۔‘‘

یہ لوگ ایمان لائے تھے لیکن پھر انہوں نے کفر کیا۔ کسی شخص کا جان بوجھ کر منافق بننا یعنی شعوری نفاق بہت شاذ ہوتا ہے۔ جیسے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷۲ میں آیا ہے کہ اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے سازش کی اور کہا کہ صبح کے وقت اپنے ایمان کا اعلان کرو اور شام کو کفر کا اعلان کر دو‘ علی الاعلان مرتد ہو جاؤ۔ اس طرح مسلمانوں میں کچھ نہ کچھ تو شک پیدا ہو جائے گا‘ ان میں کسی درجے میں تو اشتباہ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ جو جمے ہوئے ہیں‘ راسخ الایمان ہیں‘ ان کے ایمان کی پختگی میں کمی آئے گی۔ جو شخص چند گھنٹے بظاہر مسلمان کے طور پر رہا‘ اسے یہ معلوم ہے کہ مَیں مسلمان نہیں ہوں‘ بلکہ شعوری طور پر‘ پورے ارادے کے ساتھ دھوکا دے رہا ہوں۔ یہ شعوری نفاق ہے جو ایک بالکل علیحدہ استثنائی کیفیت ہے۔ وہ نفاق جو بالعموم موجود تھا‘ شعوری نہیں بلکہ غیر شعوری نفاق تھا۔ اسی لیے اس رکوع میں لَا یَشْعُرُوْنَ اور لَا یَعْلَمُوْنَ جیسے الفاظ آ رہے ہیں کہ ان کو شعور اور احساس نہیں‘ ان کو معلوم نہیں کہ یہ کدھر جا رہے ہیں‘ کس وادی میں بھٹک رہے ہیں۔ یا

جیسے کہ سورۃ المنافقون میں آیا: ﴿ فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۳﴾ ﴾ چنانچہ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور یہ تفقہ (سمجھ بوجھ) سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ حقیقی فہم اب ان کے پاس نہیں رہا۔

مکّی اور مدنی دور کے نفاق میں فرق

مکی اور مدنی دور کے نفاق میں باریک سا فرق ہے۔ مکی دور میں جو بھی ایمان لاتا' خلوص اور شعور کے ساتھ ایمان لاتا۔ اس لیے کہ وہاں ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی سرسری طور پر ایمان لے آئے۔ اسے معلوم ہوتا کہ یہ تو اپنے معاشرے سے کٹنے والی بات ہے۔ قبیلے سے تعلق منقطع ہو جائے گا۔ بہنوں اور بھائیوں سے تعلق ختم ہو جائے گا۔ پھر وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ ایمان لانے والوں پر کیا بیت رہی ہے۔ چنانچہ جو بھی ایمان لاتا' خلوص کے ساتھ لاتا تھا۔ البتہ یہ قدرت کا معاملہ ہے کہ سب کے اندر یکساں قوتِ ارادی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی طبیعت کے اندر ایک کمزوری کا احساس پیدا ہوتا ہے' جیسے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ رہے ہوں' ہمت جواب دے رہی ہو۔

جس زمانے میں اہلِ ایمان پر شدید ترین تعذیب (persecution) ہو رہی تھی' مکّہ میں صحابہ کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ آپ ﷺ اُس وقت خانہ کعبہ کی دیوار کے سائے میں اپنی چادر کو تکیہ بنا کر استراحت فرما رہے تھے۔ حضرت خباب بن الارت ؓ اس واقعہ کے راوی ہیں۔ یہ وہ صحابی ہیں جن کو شدید ترین ایذا دی گئی۔ دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھا کر ان سے کہا گیا کہ کُرتا اتار کر ننگی پیٹھ ان انگاروں پر لیٹ جاؤ! وہ لیٹ گئے۔ پیٹھ کی کھال جلی' چربی پگھلی' اسی سے وہ انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ وہ اپنا کُرتا اٹھا کر لوگوں کو جلی ہوئی کمر کے نشان دکھایا کرتے تھے کہ یہ حالات مجھ پر بیتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے آ کر حضور ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اب تو مظالم ناقابلِ برداشت ہو رہے ہیں' کیا آپؐ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے مدد کی دعا نہیں کرتے کہ وہ ہمیں ان درندوں کے ظلم و بربریت سے بچا لے۔ یہ الفاظ سن کر حضور ﷺ کا چہرۂ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا اور آپ ﷺ اُٹھ کر بیٹھ

گئے۔ پھر فرمایا: اللہ کی قسم! تم بہت جلدی مچا رہے ہو۔ تم سے پہلے تو ایسا بھی ہوا کہ ایمان والوں کو لایا جاتا تھا اور ان کا آدھا دھڑ زمین کے اندر گاڑ کر سر پر آرا رکھ کر چیرنا شروع کرتے اور پورے دھڑ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتے۔ یہ بھی ہوا کہ آگ کے الاؤ جلائے گئے اور زندہ لوگوں کو اس میں جلا دیا گیا (سورۃ البروج میں تفصیل سے واقعہ موجود ہے)۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوہے کے بڑے بڑے کنگھوں سے ہڈیوں کے اوپر کا گوشت کھرچ دیا جاتا تھا لیکن وہ پھر بھی ثابت قدم رہتے تھے۔ اللہ کی قسم! وہ وقت آ کر رہے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے سوائے اللہ کے اور کسی کا خوف نہیں ہوگا' یا صرف بھیڑیے کا خوف ہوگا کہ کہیں اس کی بکریوں پر حملہ نہ کر دے۔ (صحیح البخاری' کتاب المناقب' ح ۳۶۱۲) یعنی آخر کار اہلِ ایمان کے لیے مکمل طور پر امن کی کیفیت پیدا ہو جائے گی' لیکن ع ''ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!'' ابھی تو سختیاں آئیں گی' تم جلد بازی کر رہے ہو۔

سورۃ العنکبوت میں خبردار کر دیا گیا تھا کہ اگر تم نے صبر و استقامت کا مظاہرہ نہ کیا تو یہ کیفیت نفاق کی طرف لے جانے والی ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتۡنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ ؕ ﴾ (آیت ۱۰)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر' مگر جب انہیں اللہ کی راہ میں ایذا پہنچائی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی ایذا رسانی کو اللہ کے عذاب کی مانند سمجھ لیتے ہیں۔''

البتہ ایسی کوئی مثال بالفعل ہمارے سامنے موجود نہیں کہ مکّہ مکرمہ میں نفاق کا پودا پروان چڑھ گیا ہو۔ تاہم اہلِ ایمان کو آغاز ہی میں مرضِ نفاق کی آخری سٹیج سے خبردار کر دیا گیا تھا۔ اس کا ظہور بعد میں اُس مرحلے پر ہوا جب ہجرت لازم کر دی گئی تو اہلِ مکّہ میں سے بھی کچھ لوگ ایسے کم ہمت ثابت ہوئے جو ایمان تو لے آئے تھے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ گویا کہ وہ اپنے کنبوں اور قبیلوں سے کٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہاں ان کا

ایمان ان کا ساتھ نہ دے سکا اور ان کی ہمت جواب دے گئی۔ اس ضمن میں پھر سورۃ النساء میں اہلِ ایمان سے کہہ دیا گیا: ﴿فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ اَوْلِیَآءَ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۸۹) ’’لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔‘‘ یعنی اگر یہ ہجرت نہیں کرتے تو اب تمہارا ان سے کوئی رشتہ وتعلق نہیں۔ چنانچہ مکی دور میں عددی اعتبار سے بڑے پیمانے پر نفاق کا باضابطہ ظہور یا کوئی نمایاں کیفیت ہجرت تک سامنے نہیں آئی۔ البتہ مدینہ میں آ کر یہ دونوں کیفیات ظاہر ہوئیں۔ مکی دور کے نفاق کی کیفیت بھی سامنے آئی‘ یعنی کچھ لوگ خلوص کے ساتھ جان بوجھ کر‘ سوچ سمجھ کر‘ پورے شعور کے ساتھ ایمان لائے‘ لیکن بعد میں ہمت جواب دے گئی۔ یہ بالکل دوسری بات ہے۔ آپ نے ایک وقت میں پختہ ارادہ کیا‘ لیکن بعد میں آپ کی ہمت میں کمزوری کا ظہور ہوا‘ قوتِ ارادی ساتھ چھوڑ گئی۔

ایمان اور اسلام میں فرق

اس کے علاوہ مدینہ میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سرسری طور پر ایمان لے آئے۔ اسی کی ایک بڑے پیمانے پر وہ شکل تھی جو سورۃ الحجرات میں بیان ہوئی ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

’’یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے‘ اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔‘‘

یہ سرسری طور پر ایمان لانا اس اعتبار سے ہوا کہ مدینہ میں دو ہی قبیلے عربی الاصل تھے۔ یہود کے قبائل عربی النسل نہیں تھے‘ یہ دوسرے علاقوں سے وہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ اصل میں عرب قبائل جو یمن سے آ کر مدینہ میں آباد ہوئے‘ وہ اوس اور خزرج تھے۔ یہ دونوں اجتماعی طور پر (en bloc) ایمان لے آئے۔ کیفیت ایسی ہوگئی کہ ان کے سردار ایمان لے آئے تو گویا سب نے ایمان قبول کر لیا۔ تبھی تو ہجرت کے وقت حضور ﷺ

کا مدینہ میں داخلہ گویا ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہوا۔ کئی دنوں سے لوگ آپ ﷺ کی آمد کے منتظر تھے کہ کب یہاں پہنچیں تو ہم خوشیاں منائیں۔ اس اعتبار سے وہاں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو محض اس وجہ سے مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے کہ جب پورے کا پورا قبیلہ مسلمان ہے تو ہم بھی مسلمان ہیں۔ یہ سرسری ایمان کی قسم ہے۔ اس کیفیت کی منطقی انتہا اس وقت ہوئی جب پورے عرب پر اسلام کا غلبہ ہو گیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۙ﴿۱﴾ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾

’’جب آ جائے مدد اللہ کی اور فتح نصیب ہو۔ اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔‘‘

یہ فوج در فوج داخل ہونا بھی اسی نوعیت کا تھا کہ قبائل نے اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر مشورے کیے کہ اب تو بات ختم ہوگئی‘ حضرت محمد ﷺ کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوچکی ہے‘ لہٰذا ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم بھی اللہ کے دین میں داخل ہوجائیں۔ خاص طور پر جبکہ چیلنج بھی سامنے آ گیا تھا:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ﴾

(التوبۃ:۵)

’’پھر جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ۔‘‘

اعلانِ عام آ گیا کہ یا تو اس سرزمین کو چھوڑ کر نکل جاؤ‘ جہاں کہیں تمہیں رہنا ہے۔ اب اس سرزمین پر تم اسلام کے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ جب اَشْھُرِ حُرُم ختم ہوں گے تو قتلِ عام ہوگا۔ ایسے حالات میں جو لوگ ایمان لائے‘ یقیناً ان میں مؤمنینِ صادقین بھی تھے اور منافق بھی تھے جنہوں نے شعوری طور پر فیصلہ کیا کہ ٹھیک ہے اب تو ہم بے بس ہو گئے ہیں‘ اس وقت تو اپنا سر نیچا کر لو‘ دبک جاؤ اور اسلام کا کلمہ پڑھ لو۔ پھر جب وقت آئے گا‘ کوئی مناسب موقع ہوگا‘ تب دیکھ لیں گے اور نمٹ لیں گے۔ البتہ ان میں بڑی تعداد

ایسی تھی کہ جن میں کوئی بدنیتی یا دھوکا دینے کا ارادہ نہیں تھا‘ مرتد ہونے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا‘ نہ کسی اور موقع کا انتظار تھا‘ لیکن انہیں ذاتی سطح پر مثبت طور پر ایمان بھی حاصل نہیں ہوا۔ ان کے لیے مَیں نے عنوان تجویز کیا ہے: ’’سرسری ایمان‘‘۔ اس نوعیت کا ایمان تکلیف اور آزمائش کے وقت پرکھا جاتا ہے۔ چنانچہ مدینہ میں جب آزمائش شروع ہوئی تو ان کا نفاق ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔

غور کیجیے کہ حضور ﷺ جب غزوۂ احد کے لیے مدینہ سے نکلے تو اُس وقت ایک ہزار کی نفری تھی اور جب ذرا باہر گئے تو تین سو افراد واپس ہو گئے۔ کُل تعداد کا ایک تہائی کوئی معمولی نفری نہیں ہے۔ اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ کیسے ہو گیا۔ ان میں شعوری منافق تو شاید کچھ ہی لوگ ہوں‘ ہم تعین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔ قرائن یہی ہیں کہ عبداللہ بن اُبی تو بلاشبہ شعوری منافق تھا۔ وہ اہلِ مدینہ کا سب سے بڑا سردار تھا‘ جس کی بادشاہت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس کے لیے سونے کا تاج بھی تیار کیا جا چکا تھا‘ صرف تاج پوشی باقی تھی کہ حضور ﷺ مدینہ تشریف لے آئے۔ اب اُس نے اپنے دونوں قبائل کا رنگ دیکھا کہ ان میں سے اکثر لوگ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ گویا اس کے لیے فیصلہ کن مرحلہ تھا کہ یا تو میں ابھی ان سے علیحدہ ہو جاؤں۔ اس صورت میں میری سرداری اور چودھراہٹ ختم ہو جائے گی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اس وقت (جس کو پنجابی میں کہتے ہیں ’’نیویں پا کر‘‘) سر جھکا لو اور بعد میں موقع ملنے پر پیٹھ میں چھرا گھونپا جائے‘ جیسا کہ اُس نے غزوۂ اُحد کے موقع پر کر دکھایا۔ سورۃ المنافقون میں اس کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿لَئِنۡ رَّجَعۡنَاۤ اِلَى الۡمَدِيۡنَةِ لَيُخۡرِجَنَّ الۡاَعَزُّ مِنۡهَا الۡاَذَلَّ ؕ﴾ (آیت ۸) ’’اگر ہم مدینہ لوٹ گئے تو عزّت والے ان ذلیلوں کو نکال باہر کریں گے۔‘‘ الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کے دل میں کیا روگ تھا۔ حضور ﷺ کے خلاف کتنا غصہ‘ بغض‘ عناد اور شقاق تھا۔ اس نے مجبوراً ایمان کا اظہار کیا تھا‘ اس لیے کہ جب پوری قوم ایمان لے آئی تو اب وہ اکیلا کیا کرے گا! چنانچہ ان میں شعوری منافق بھی یقیناً ہوں گے‘ لیکن بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو سرسری طور پر شامل ہو گئے تھے۔ اب جب آزمائش کا

مرحلہ آیا اور انہیں معلوم ہوا کہ قریش کا تین ہزار کا لشکر کیل کانٹے سے لیس باہر کھڑا ہے تو یہ بہانہ بنا کر کہ جب ہمارے مشورے پر عمل ہی نہیں ہوا تو ہم کیوں خوامخواہ اپنی جان کے لیے خطرات مول لیں‘ واپس ہو گئے۔

مکّہ میں نفاق کی صورت محض امکانی یا احتمالی (potential) تھی‘ ایک ادارے (institution) کی حیثیت سے اس دور میں کہیں اس کا وجود نظر نہیں آتا۔ اس معاشرے میں‘ اس جماعت کے اندر جو اس وقت حضور ﷺ پر ایمان لائی‘ کوئی ایسا گروہ نظر نہیں آتا کہ جس کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو چکی ہو۔ وہاں صرف متنبہ کر دیا گیا کہ اگر تمہارے صبر وتحمل میں کمی ہوئی‘ اگر تم استقامت کا ثبوت نہیں دو گے‘ اگر آزمائشیں برداشت نہیں کرو گے تو دیکھو پھر یہ راستہ تمہیں نفاق کی طرف لے جائے گا۔ یہ ایک طرح کا caution اور warning ہے‘ جیسے کوئی ڈاکٹر ٹی بی کے کسی ایسے مریض کو بتائے جو ابھی پہلی سٹیج میں ہو کہ اگر علاج نہیں کرو گے‘ پرہیز نہیں کرو گے‘ ہدایات پر عمل نہیں کرو گے تو پھر یہ نتیجہ نکلے گا۔ مکی دور میں معاملہ اس درجے کا تھا۔ البتہ کچھ لوگوں کا معاملہ ہجرت کے مرحلے پر آ کر زیادہ ظاہر ہو گیا۔ اب امتحان یہ تھا کہ اپنے رشتہ داروں اور قبائل کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو یا نہیں!

مدینہ میں آ کر تین اقسام کے نفاق ہو گئے۔ ایک تو مکّہ میں جو امکانی (potential) نفاق تھا‘ یہاں آ کر اس نے حقیقی نفاق کی شکل اختیار کر لی اور اب اس کا بالفعل ظہور ہوا۔ دوسرے وہ لوگ جو سرسری طور پر ایمان لائے‘ صرف اس وجہ سے مسلمان ہو گئے کہ پورا قبیلہ‘ پورا گھرانہ اسلام لا رہا ہے‘ ایسے لوگوں میں اس کیفیت کا دس گنا نہیں سو گنا زیادہ امکان ہے کہ آزمائش اور ابتلاء کے موقع پر ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ جائیں اور ان کی ہمت جواب دے جائے۔ تیسرا شعوری نفاق ہے۔ جیسے کہ گمان غالب کے طور پر عبداللہ بن اُبی کا معاملہ تھا‘ اور یہود کا سازش کے طور پر معاملہ ہوا کہ صبح ایمان لاؤ اور شام کو مرتد ہو جاؤ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں نے چند دن اسلام میں رہ کر پھر یہ معاملہ کیا ہو‘ تا کہ مسلمانوں کی ہوا اُکھڑ جائے اور ان کی ساکھ متاثر ہو۔

سورۃُ النُّور کی آیات سے تقابل

آخر میں تفسیرِ قرآن کے اس اصول کا اعادہ کر رہا ہوں کہ ’’اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا‘‘ یعنی قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اس اعتبار سے مختلف مقامات کی باہم مشابہتوں کو نمایاں کیا جائے تو فہمِ قرآن میں کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی پہلی پانچ آیات کا سورۂ لقمان کی پہلی پانچ آیات سے تقابل ذہن میں رکھیے‘ یہ بہت ہی گہرا تقابل ہے۔ پھر بحیثیتِ مجموعی سورۃ البقرۃ کے پہلے رکوع کی سورۂ یٰسین کے پہلے رکوع سے مشابہت ہم ملاحظہ کر چکے ہیں۔

مزید برآں بحیثیتِ مجموعی مشابہت کے اعتبار سے سورۃ البقرۃ کے ان دو رکوعوں کا مثنیٰ سورۃ النور کا پانچواں رکوع ہے۔ جیسے یہاں تین گروہ ہمارے سامنے آئے: اولاً مؤمنینِ صادقین ﴿اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّہِمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵﴾ اور ان کی صفات: ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝۵﴾ بالکل یہی نقشہ سورۃ النور کے پانچویں رکوع کے اندر موجود ہے‘ جہاں پہلے ایمان کی بحث اور ایمان کے لیے تمثیل آئی ہے۔ ان کے نورِ ایمان کی مثال ایسے ہے گویا ان کے قلب کے اندر ایک قندیل روشن ہے۔ چنانچہ ایمان کے لیے تمثیل اور اہلِ ایمان کا کردار بیان ہوا۔ وہی تین گروہ جن کا ذکر یہاں (سورۃ البقرۃ میں) ہو رہا ہے ان ہی تین گروہوں کا ذکر سورۃ النور میں ہے۔ وہاں بھی کفر کی دو حالتیں (shades) بیان کی گئیں۔ کفر کی ایک حالت وہ ہے کہ تاریکی ہی تاریکی ہے‘ کوئی ملمع کی روشنی بھی نہیں۔ خیر اور نیکی کا وجود ہی نہیں۔ نفس پرستی‘ عیش پرستی‘ مفاد پرستی اور خود غرضی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جھوٹ موٹ کی بھی کوئی نیکی نہیں۔ یہ کفر کی انتہا ہے:

﴿اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُہَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَہٗ لَمْ یَکَدْ یَرٰىہَا ؕ وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝۴۰﴾ (النور)

’’یا بہت گہرے سمندر میں اندھیروں کی مانند‘ اسے ڈھانپ لیتی ہو ایک موج‘

اس کے اوپر ہو ایک اور موج‘ اس کے اوپر ہوں بادل۔ اندھیرے ہی اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اُسے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور جس کو اللہ نے ہی کوئی نُور عطا نہ کیا ہو تو اُس کے لیے کہیں کوئی نُور نہیں ہے۔‘‘

ایسے اندھیرے جو بڑے گہرے سمندر میں ہوں۔ موج کے اوپر موج‘ پھر اوپر بادل بھی کہ چاند یا ستاروں کا بھی کوئی انعکاس نہ ہو رہا ہو (absolute darkness)‘ تاریکی کا یہ عالم کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ sense of direction موجود ہے‘ اس کے باوجود دیکھ نہیں پا رہا۔ یہ انتہائی تاریکی کی مثال ہے۔ اس کے مقابل یہاں سورۃ البقرۃ میں اس کیفیت کی مثال بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَہُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۝۱۸﴾ یہ انتہائی کفر کی کیفیت ہے۔

سورۃ النور میں دوسری مثال بیان کی گئی:

﴿وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اَعْمَالُہُمْ کَسَرَابٍۭ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا وَّ وَجَدَ اللّٰہَ عِنْدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝۳۹﴾

’’اور جو کافر ہیں اُن کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب کسی چٹیل میدان میں‘ پیاسا اُسے پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جب اس کے پاس آیا تو اُس نے وہاں کچھ نہ پایا‘ البتہ اُس نے اس کے پاس اللہ کو پایا‘ تو اُس نے پورا پورا چکا دیا اُسے اس کا حساب۔ اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔‘‘

یعنی سراب کے مانند کچھ نیکیاں ہیں۔ ریاکاری‘ دکھاوے اور ملمع کی نیکی موجود ہے۔ کچھ نہ کچھ چمک دمک ہے‘ کردار اور زندگی میں کچھ روشنی نظر آ رہی ہے‘ مگر یہ حقیقت نہیں سراب ہے۔ دیکھنے میں پانی نظر آتا ہے‘ لیکن حقیقت میں پانی نہیں ہوتا۔ پیاسا گھسٹتا ہوا اس کے قریب آتا ہے‘ پیاس کے مارے اس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے‘ لیکن اسے پانی نہیں‘ موت منتظر ملتی ہے۔ یہ وہ بین بین کی کیفیت ہے کہ محض ملمع اور ریاکاری کی نیکی ہے۔ آخرت میں معلوم ہو جائے گا کہ اس نیکی کا کوئی وزن نہیں۔ بین بین کا یہی معاملہ

نفاق کا ہے جو یہاں بیان کیا گیا۔ چاہے اس کو کفر کی دو تمثیلیں کہہ لیا جائے یا نفاق کی‘ اس لیے کہ نفاق بھی درحقیقت کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مرضِ نفاق سے محفوظ رکھے!

کیفیاتِ قلب اور دعاؤں کا خصوصی اہتمام

قرآن مجید کے ان مقامات سے گزرتے ہوئے طبیعت میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر فرد کے دل میں کچھ نہ کچھ احساسات ہوتے ہیں۔ میرا جو بھی تجربہ ہے‘ اس میں آپ کو بھی شریک کر لیا کرتا ہوں۔ مَیں ان رکوعوں کی تلاوت کرتا ہوں تو جب پہلا حصہ سامنے آتا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵﴾ اس پر ایک ردِّعمل طبیعت میں ہونا چاہیے: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! مذکورہ صفات میں سے ایک ایک چیز کے لیے دعا کیجیے۔ ﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ﴾ (ابراھیم:۴۰) ’’پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا دے اور میری اولاد کو بھی۔‘‘ پروردگار! مجھے انفاق کرنے والا بنا دے۔ مجھے ایمانِ حقیقی عطا فرما۔ مجھے ہدایت پر قائم کر دے اور جو ہدایت تُو نے مجھے دی ہے اس پر استقامت عطا فرما۔

جب دوسرا حصہ آئے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷﴾ اس پر میرے قلب میں شکر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَجْعَلْنِیْ مِنْھُمْ ’’پروردگار! تیرا شکر ہے کہ تُو نے ہمیں اس گروہ میں شامل نہیں کیا‘ ایسے لوگوں کے زمرے سے بچایا ہے۔‘‘ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف:۴۳) ’’اور کُل شکر‘ کُل ثنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ ہدایت بخشی اور ہم یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے اگر اللہ ہی نے ہمیں نہ پہنچا دیا ہوتا۔‘‘ البتہ جب تیسرا حصہ آئے تو نفاق سے اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ اس کا اندیشہ ہر مسلمان کو ہر وقت ہونا چاہیے۔ جیسے کہ جلیل القدر تابعی حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے: مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا

مُنَافِقٌ[1] ’’نفاق کا اندیشہ صرف مؤمن کو ہوتا ہے اور صرف منافق ہی اس سے اپنے آپ کو محفوظ اور مامون سمجھتا ہے۔‘‘ جب ایمان کی پونجی ہی ختم ہو گئی تو ع ’’رہا کھٹکا نہ چوری کا‘ دعا دیتا ہوں رہزن کو!‘‘ اب کیا اندیشہ ہے؟ کھٹکا اُسی کو ہوتا ہے جس کے پاس کوئی پونجی ہو۔ ایمان کی رمق موجود ہو کہ میرا ایمان سلب نہ ہو جائے‘ ایمان زائل نہ ہو جائے‘ یہ دولت مجھ سے چھن نہ جائے۔ جو پہلا معاملہ ہے کفر کا‘ اس پر اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں ان میں سے نہیں بنایا۔ اس میں بھی درحقیقت ہمارا کوئی کارنامہ نہیں بلکہ یہ اللہ کی دین اور اس کا فضل و کرم ہے۔ البتہ تیسرے معاملے پر آ کر یہ دعا کریں: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مِنْھُمْ ’’پروردگار! ہمیں اس گروہ میں شامل نہ کرنا!‘‘ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنَ النِّفَاقِ وَالرِّیَاءِ ’’اے اللہ! ہم نفاق اور ریاکاری سے تیری پناہ میں آتے ہیں۔‘‘ اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ، وَ اَعْمَالَنَا مِنَ الرِّیَاءِ، وَ اَلْسِنَتَنَا مِنَ الْکَذِبِ، وَ اَعْیُنَنَا مِنَ الْخِیَانَۃِ ’’اے اللہ! ہمارے دلوں کو نفاق سے پاک کر دے‘ ہمارے اعمال کو ریاکاری سے پاک کر دے‘ ہماری زبانوں کو جھوٹ سے اور ہماری آنکھوں کو خیانت سے محفوظ فرما۔‘‘ آمین یا ربّ العالمین!

انسان کو بار بار بڑے حضورِ قلب کے ساتھ یہ دعا مانگنا چاہیے‘ اس لیے کہ نفاق سے بچنے کی کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا آدمی‘ جتنی زیادہ اس کے پاس دولتِ ایمان ہو گی اتنا ہی وہ خطرے میں ہے۔ شیطان اتنا ہی اس پر مورچا لگائے گا اور اس کو ایمان کی دولت سے محروم کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ لوگ بڑے مغالطے میں ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہم نفاق سے مامون اور محفوظ ہیں۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کچھ منافقوں کے نام بتا دیے تھے‘

(باقی صفحہ 97 پر)

(۱) جناب ابن ابی مُلیکہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ مَیں تیس صحابہؓ سے ملا ہوں‘ ان میں سے ہر ایک اپنے بارے میں نفاق کا خطرہ محسوس کر رہا تھا‘ اور مذکورہ بالا قول جناب حسن بصریؒ سے منقول ہے۔ ملاحظہ ہو: صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب خوف المؤمن من ان یحبط عملہ وھو لا یشعر (باب ۳۶‘ ح:۴۸)

قرآن حکیم سے ہمارا تعلق

شجاع الدین شیخ ‘ امیر تنظیم اسلامی

مسجد جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی لاہور میں ۶ فروری ۲۰۲۶ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد:

استقبالِ رمضان کے عنوان سے تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام مختلف نوعیت کے اجتماعات ہوتے ہیں اور خطاباتِ جمعہ میں بھی اس طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ اس وقت یہ گفتگو کرنا مقصود ہے کہ ماہِ رمضان کی فضیلت دراصل نزولِ قرآن حکیم کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا اس ماہِ مبارک کا ایک اہم تقاضا قرآن حکیم کے ساتھ تعلق کو مضبوط بنانا ہے۔

سورۃ الطارق قرآن حکیم کے آخری پارے میں ہے‘ جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾﴾

’’یہ (قرآن) قولِ فیصل ہے‘ اور یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے۔‘‘

بلاشبہ یہ قرآن فیصلہ کن کلام ہے۔ حتمی اور دوٹوک بات ہے۔ انگریزی میں اسے decisive word کہا جائے گا جبکہ ہمارے محاورے میں کہیں گے کہ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ عربی میں ہزل ایسی شے کو کہتے ہیں جو بے کار سمجھی جائے‘ جو worthless ہو‘ جس کو پس پشت ڈال دیا جائے‘ جسے نظر انداز کر دیا جائے‘ جو فوکس میں نہ رہے‘ جس کے لیے محنت نہ کی جائے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرما رہے ہیں کہ قرآن مجید کوئی بے کار شے نہیں بلکہ فیصلہ کن کلام ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی دو احادیث بڑی معروف ہیں‘ جنہیں ہم دروسِ قرآن میں بیان بھی کرتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))(صحیح مسلم:۱۸۹۷)

’’بے شک اللہ تعالیٰ اس قرآن کریم کی بدولت کچھ قوموں کو عروج عطا فرمائے گا اور اس کو ترک کر دینے کی وجہ سے کچھ دوسری قوموں کو ذلیل اور رسوا کر دے گا۔‘‘

علامہ اقبال نے بھی اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

یہ اصول ہم ماننے والوں کے لیے بتایا جا رہا ہے‘ ورنہ دنیا کی دولت‘ شہرت‘ اقتدار فرعون کو بھی ملے‘ نمرود کو بھی اور شداد کو بھی۔ ہم جانتے ہیں کیا کچھ نہیں تھا ان کے پاس۔ چنانچہ یہ جو معیار بیان ہو رہا ہے کہ اس قرآن کی بدولت اللہ عروج عطا فرمائے گا‘ یہ ہمارے لیے ہے۔ قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرنے والوں اور واقعتاً قرآن کو تھامنے والوں کو اللہ دنیا میں عروج عطا فرمائے گا‘ ورنہ ذلیل و رسوا کر دے گا‘ جو آج ہماری حالت ہے۔ ہم سے پہلے بنی اسرائیل اُمتِ مُسلمہ تھے۔ ان کے خلاف چارج شیٹ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں بیان فرمائی کہ:

﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ (آیت ۱۰۱)

’’جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا‘‘

انہوں نے اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈالا تو ذلت اور رسوائی ان کا مقدر بنی۔ آج کتاب ہمارے پاس ہے‘ جسے ہم فراموش کیے بیٹھے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہماری جو حالت ہے‘ بتانے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں سب سے سستا خون ہمارا ہے۔ پچھلی صدی میں سب سے زیادہ لاشیں مسلمانوں کی گری ہیں۔ کسی قوم کے بارے میں دوسروں نے سب سے زیادہ فیصلے کیے ہوں تو وہ ہم مسلمان ہیں۔ سب سے زیادہ قبضے ہمارے ممالک پر ہوئے ہیں۔ اس اُمت کے زوال کی ایک بہت بڑی وجہ قرآن کریم کو فراموش کر دینا ہے۔ ہم ایک مسلمان ملک بھی دنیا کے سامنے ایسا نہیں دکھا سکتے کہ جس قرآن کی ہم تلاوت کرتے ہیں‘ جس کی سماعت کرتے ہیں اس کے احکامات کا اجتماعی سطح پر وہاں نفاذ ہو۔ یہ ہمارا قرآن کے ساتھ اجتماعی سطح پر معاملہ ہے۔ دنیا میں تو اللہ کے فیصلے قوموں کے اجتماعی اعمال پر نافذ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ دنیا میں قرآن کے فیصلہ کن کردار کا معاملہ ہوا۔

انفرادی حوالے سے دنیا کا معاملہ عارضی ہے۔ ہر ایک نے یہاں سے جانا ہے۔ ہر جانے

والا بتا کر جاتا ہے کہ تم بھی میرے پیچھے آؤ گے۔ کسی کے انتقال کی خبر پر ہم یہ الفاظ ادا کرتے ہیں: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ’’یقیناً ہم اللہ ہی کے ہیں اور بلاشبہ اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔‘‘ جنازے کی معروف دعا ہے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَ مَیِّتِنَا وَ شَاھِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِیْرِنَا وَ ذَکَرِنَا وَ اُنْثَانَا

اس میں پہلے زندہ لوگوں کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں‘ پھر میت کے لیے۔ پھر اپنے چھوٹوں‘ بڑوں‘ مردوں‘ عورتوں سب کے لیے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ مُردوں کو قبرستان جانے کی تاکید ہے تاکہ عبرت پکڑیں۔ قبرستان میں داخل ہوتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ، یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ

اس میں بھی پہلے اپنی مغفرت مانگ رہے ہیں۔

اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ

تم ہم سے پہلے جاچکے ہو‘ ہم تمہارے پیچھے آنے والے ہیں۔ یہ سب موت کی یاددہانی ہے۔ میں نے اور آپ نے بھی جانا ہے۔ دنیا تو چھوڑنی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی یعنی آخرت میں بھی یہ قرآن کریم ہی فیصلہ کن کلام ہوگا۔ مسلم شریف کی ایک اور طویل روایت کا آخری حصہ ہے‘ جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْقُرْآنُ حُجَّۃٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ))

یہ قرآن حکیم تمہارے حق میں حجت ہوگا یا تمہارے خلاف شکایت لے کر کھڑا ہوگا۔

بہرحال ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ہم آج قرآن حکیم کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کیا ہم اس کو اپنے حق میں سفارش کرنے والا بنا رہے ہیں یا (معاذ اللہ!) شکایت کرنے والا۔ اس موضوع پر استادِ محترم بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا بڑا پیارا کتابچہ ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ بہت قیمتی ہے۔ اس کا شارٹ ورژن بھی ہے: ’’قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں۔‘‘ کم سے کم وہی ہماری نگاہوں سے گزرتا رہے۔ اول الذکر کتاب میں ڈاکٹر صاحبؒ نے پانچ حقوق بیان فرمائے ہیں۔ ان حقوق کو اگر ہم ادا کریں تو ان شاء اللہ قرآن مجید کے ساتھ تعلق مضبوط ہوگا۔ نمبر ایک‘ اس پر ایمان لائیں۔ یہ ایمان صرف lip servicing نہ ہو بلکہ دل سے بھی یقین ہو۔ اِقرارٌ بِاللّسان و تصدیقٌ بِالقلب۔ نمبر دو‘ قرآن پاک کی

روزانہ باقاعدہ تلاوت ہو‘ اس کے آداب کے ساتھ۔ نمبر تین‘ قرآن حکیم کو سمجھنے کا اہتمام کرنا۔ ابن ماجہ کی ایک حدیث مبارکہ کی رُو سے قرآن مجید کے ایک حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں عطا ہوتی ہیں‘ لیکن قرآن حکیم کا اولین تعارف یہ نہیں کہ یہ ثواب کی کتاب ہے۔ ثواب یقیناً ملتا ہے اور بغیر سمجھے بھی تلاوت کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ اس حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ (الٓمّٓ میں) الف ایک حرف ہے‘ لام ایک حرف ہے‘ میم ایک حرف ہے۔ ان کا مفہوم ہمیں نہیں معلوم‘ ان کا ترجمہ تو ہم نہیں کرتے‘ ان کو حروفِ مقطعات کہا جاتا ہے۔ اسی لیے بغیر سمجھے بھی قرآن کریم کی تلاوت کا اجر ملتا ہے‘ البتہ primarily قرآن کتابِ ہدایت ہے۔ فرمایا گیا:

﴿ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ②﴾ (البقرۃ)

’’ہدایت ہے پرہیزگار لوگوں کے لیے۔‘‘

اسی طرح سارے انسانوں کے لیے ہدایت ہے:

﴿ھُدًی لِّلنَّاسِ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

’’لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر (نازل کیا گیا)‘‘

پھر ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ﴾ (بنی اسرائیل:۹)

’’یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔‘‘

اور:

﴿کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ (ابراھیم:۱)

’’یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف۔‘‘

بندگانِ خدا گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر ہدایت کی روشنی کی طرف آجائیں‘ اس لیے قرآن پاک کی آیات عطا کی گئیں۔

چوتھا حق ہے اس پر عمل کرنا۔ یہ قرآن صرف ثواب کے لیے نہیں ہے‘ صرف فہم کے لیے نہیں ہے‘ صرف علم حاصل کر لینے کے لیے نہیں ہے۔ یہ سب بھی کیا جائے لیکن اس سے آگے اس کو اپنے عمل میں translate کرنا اور اس کے تقاضوں کو عملی طور پر پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ انفرادی زندگی سے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ نماز ادا کرو‘ زکوٰۃ ادا کرو‘ روزہ رکھو۔ جھوٹ

مت بولو۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ رشتہ دار اور پڑوسی کا حق ادا کرو۔ کمزوروں کی مدد کرو۔ وراثت کے احکام پر عمل کرو۔ یہ وہ احکام ہیں جو انسان کی انفرادی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان پر فوراً عمل ہو سکتا ہے۔ اگر نہیں کر رہے تو اس میں ہمارا قصور ہے۔ پھر قرآن کریم کے وہ اَحکام ہیں جو اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ قرآن پاک قصاص ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قصاص جان کا بھی ہوتا ہے اور زخموں کا بھی۔ سورۃ المائدہ میں زخموں کے قصاص کا ذکر بھی ہے۔ اسی طریقے پر زکوٰۃ اور عشر کی وصولی کا معاملہ آئے گا۔ شرعی سزاؤں کے نفاذ کی بات آئے گی۔ سوشل ویلفیئر کا پورا سسٹم آئے گا۔ اجتماعی معاملات میں بھی قرآن پاک کے احکام کا نفاذ ہونا چاہیے۔ یہ چوتھا حق ہے کہ قرآن مجید کے احکام انفرادی سطح پر تو فوراً لاگو ہوں جبکہ اجتماعی سطح پر ان کے نفاذ کی کوشش ہو۔

پانچواں حق قرآن کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرنا ہے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری میرے اور آپ کے کاندھوں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ قرآن پاک کے حقوق کو ادا کرنے کی کوشش کریں تاکہ کل شرمندگی اور ندامت نہ ہو۔ یہ قرآن ہمارے حق میں سفارش کرنے والا ہو۔

سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ﴾

''اگر ہم اس قرآن کو اُتار دیتے کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔''

اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن میں اس قدر جلال ہے کہ اگر یہ کسی پہاڑ پر نازل کیا گیا ہوتا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیتا۔ وہ قلبِ محمدی ﷺ تھا جسے اللہ نے اس کام کے لیے تیار کیا تھا۔ یہ حضور ﷺ کی عظمت اور آپ ﷺ کے قلب اطہر کی شان ہے۔ درحقیقت اس قرآن کا جلال یہ ہے کہ کسی پہاڑ پر نازل ہوتا تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ کیا آج ہماری آنکھوں میں اس قرآن کے کوئی اثرات دکھائی دیتے ہیں؟ ہمارے دل کی حرکت پر قرآن کے کوئی اثرات دکھائی دیتے ہیں؟ ہمارے چہروں پر کبھی قرآن کے اثرات نظر آتے ہیں؟ ہمارے وجود کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں؟ کیا کبھی کبھی یہ کیفیات ہمیں نصیب ہوتی ہیں؟ کیا ہمیں یقین ہے

کہ یہ اللہ کا کلام ہے؟ کیا ہم اسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتے ہیں؟ کیا یہ ایقان حاصل ہے کہ یہ پہاڑوں کو ہلا دینے والا کلام تقدیروں کو بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①﴾ (القدر)

''یقیناً ہم نے اتارا ہے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں۔''

تقدیروں کو بدلنے والی رات میں قرآن کا نزول ہوا' بلکہ وہ رات نزولِ قرآن کی وجہ سے افضل ہوئی۔ رمضان افضل ہے تو نزولِ قرآن کریم کی وجہ سے۔ آج ہمارے اندر یہ احساس مفقود ہے۔ فلموں اور ڈراموں کے ڈائیلاگ سن کر لوگوں کے آنسو بہہ جاتے ہیں۔ استغفر اللہ! دوست ناراض ہو گیا تو آنسو بہہ جاتے ہیں۔ اولاد نے کچھ کہہ دیا تو آنسو بہہ جاتے ہیں۔ آئی فون کا نیا ورژن نہیں ملا تو آنسو بہہ جاتے ہیں۔ بچی کی شادی پر پچاس لاکھ روپے خرچ کر کے بھی رو رہے ہیں کہ ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ سے ایسا بہت کچھ نہ کر سکے جو کرنا چاہتے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! ہم لوگ کہاں کہاں روتے ہیں' یہ سب کو پتہ ہے۔ غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ کبھی اللہ کے کلام کو سن کر بھی چہرے کا رنگ بدلتا ہے؟ دل کی حرکت تیز ہوتی ہے؟ نہیں! اس لیے کہ we don't understand Quran۔ اس سے پہلے inclination اور موٹیویشن کا معاملہ بھی ضروری ہے۔ طلب اور تڑپ کی ضرورت ہے۔ عربی تو ابولہب کو بھی بہت آتی تھی اور خوب آتی تھی۔ اسے سنانے والے تھے محمدٌ رسول اللہ ﷺ۔ داعیٔ قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جن پر نزولِ قرآن ہوا' وہ ابولہب کو سنا رہے ہیں جسے اتنی عربی آتی تھی کہ میں اور آپ سیکھ نہیں سکتے۔ اتنی بڑی opportunity' لیکن اثر نہیں ہوا۔ مسئلہ یہ تھا کہ دل کے اوپر قفل لگا ہوا ہے۔ طلب نہیں' تڑپ نہیں۔ چنانچہ اسے سورۃ اللھب تو ملی' ہدایت نہیں ملی۔ اس کے برعکس حضرت سلمان ؓ فارس کے تھے' غیر عرب' لیکن دل میں طلب اور تڑپ تھی۔ مشرکانہ ماحول کو دل قبول نہیں کرتا۔ کبھی ایک پادری کے پاس جاتے ہیں' کبھی دوسرے کے پاس۔ آخر بتایا جاتا ہے کہ جاؤ کھجور والی سرزمین میں' وہاں آخری رسول کا ظہور ہونے والا ہے۔ چنانچہ اللہ نے پہنچایا حضور ﷺ کے قدموں میں' اور ایمان کی دولت ملی۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ((سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ)) یعنی سلمانؓ ہمارے اہلِ بیت میں شامل ہیں۔ اللہ اکبر! لہٰذا طلب کا ہونا لازمی ہے۔

ہماری ۹۹ فیصد آبادی نے زندگی میں ایک مرتبہ بھی قرآن کا مکمل ترجمہ اپنی زبان میں نہیں پڑھا ہے۔ ہم اللہ کو کیا جواب دیں گے! خاص طور پر جو پڑھے لکھے لوگ ہیں‘ well qualified ہیں‘ جو اپنے بچوں کی دنیاوی تعلیم پر اس سے کہیں زیادہ خرچ کر رہے ہیں جو ان کے والدین نے ان پر کیا تھا‘ ان کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ what about the Word of Allah!

آج اللہ کا کلام نظر انداز ہو رہا ہے۔ ہمارے استاد ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ بقول شخصے قرآن کی قوالی کر کر کے دنیا سے چلے گئے۔ لیکن دروسِ قرآن‘ دورۂ ترجمہ قرآن‘ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب‘ عربی گرامر کلاسز‘ رجوع الی القرآن کورسز‘ انجمن ہائے خدام القرآن‘ تنظیم اسلامی یہ سب اسی بڑے کام کے لیے ہیں۔ لوگ ماہِ رمضان میں تراویح کے دوران قرآن کو سنتے چلے جاتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ اللہ نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ پر فضل فرمایا کہ انہوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں اسی شہر لاہور میں ایک ترتیب بنائی‘ جس کو اب ہم دورۂ ترجمہ قرآن مع تراویح کہتے ہیں۔ اس میں قرآن کا ترجمہ بھی ہوگا‘ تشریح بھی ہوگی اور نماز تراویح بھی ہوگی۔ اس کی ترتیب یوں ہوتی ہے کہ عشاء کے چار فرض اور دو سنتیں ادا کرنے کے بعد تراویح کی چار رکعات کے حوالے سے مدرس ہر آیت کی تلاوت کرتا ہے۔ پھر اس کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد تراویح میں متعلقہ حصہ تلاوت کیا جاتا ہے‘ جو حاضرین کی سمجھ میں بھی آتا ہے کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے اس کا ترجمہ اور تشریح سنی ہوتی ہے۔ اس طرح تین اعتبارات سے قرآن مجید کی تکمیل ہوتی ہے اور رمضان کی راتیں قرآن حکیم کے ساتھ گزرتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو پورا سال قرآن کے ساتھ گزرتا تھا۔ رمضان شریف میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری پوری راتیں قرآن پاک کے ساتھ گزرتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری عشرہ میں پوری پوری رات قرآن پاک کے ساتھ قیام فرماتے۔ وہاں عربی کے حوالے سے مسئلہ نہیں تھا۔ ہمیں چونکہ عربی سمجھ میں نہیں آتی تو یہ ایک اچھا نظام بن گیا ہے۔ اس سے ہزاروں افراد پاکستان بھر میں اور پاکستان سے باہر بھی استفادہ کر رہے ہیں‘ الحمدللہ! اللہ تعالیٰ اس کام کو قبول کرے۔ اس سے لوگوں کی زندگی بدلتی ہوئی دیکھی گئی ہے۔ ایک ایمان افروز ماحول ہوتا ہے۔ پورا سال قرآن پاک کی تلاوت نہیں ہو پاتی اور یہاں ۲۹ راتوں میں ۱۴۰‘ ۱۵۰ گھنٹوں کے اندر ترجمہ اور

تشریح ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ قرآن کریم کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہو۔

بسنت کا تہوار

پنجاب میں حکمران یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم بسنت کے تہوار کو revive کریں گے۔ پورے شہر کے اندر موٹر سائیکلوں پر راڈ لگا رہے ہیں کہ ڈور سے گلا نہ کٹ جائے۔ جتنا کسی دہشت گرد کا لوگوں کو ہلاک کرنا ظلم ہے اتنا ہی اس طرح کی سرگرمیوں میں انسانی جانوں کا ضیاع بھی ظلم ہے۔ پہلے تو اس خونی رسم کو چلنے دیا جائے اور پھر لوگوں سے کہا جائے کہ راڈ لگا کر اپنی گردن بچاؤ۔ کل کہا جائے گا کہ ہماری روایات میں تو پٹاخے پھاڑنا اور فائرنگ کرنا بھی ہے‘ اب آپ بلٹ پروف جیکٹ اور بلٹ پروف ہیلمٹ پہن کر آیئے گا۔ پرسوں کہیں گے کہ چلو ہولی کھیلتے ہیں‘ رنگ پھینکیں گے تو لوگ واٹر پروف کپڑے پہن کر باہر نکلیں۔ یہ سلسلہ کہاں رکے گا! یہ سب کچھ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ بسنت ہندوانہ ثقافت اور ان کی تہذیب کا بھی حصہ ہے‘ کسی نے لکھا کہ ان کی مذہبی روایات کا بھی حصہ ہے۔ موسم بہار کا بھی ایک حصہ ہے۔ کسی گستاخِ رسول کی یاد کے حوالے سے بھی اس کو جوڑا گیا۔ یہ بہت سارے پہلو ہیں۔ البتہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ صرف امیروں کی عیاشی کا معاملہ ہے۔ ایک ایک چھت لاکھوں روپے میں بُک ہوگی۔ استغفر اللہ!

عیاشی کا سامان ہوتا ہے‘ ہلا گلا بھی ہوا کرتا ہے اور سارا آسمان پتنگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ حکومت کہہ رہی ہے ہم چھٹی بھی دیں گے‘ ساری ٹرانسپورٹ فری کریں گے۔ کیا حکومتی خزانہ آپ کی آبائی جاگیر ہے؟ یہ قوم کے ٹیکسز کا پیسہ ہے۔ جس معاشرے میں غربت کا یہ عالم ہو کہ لوگ معاشی حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر مجبور ہوں‘ زندگی کی بنیادی ضرورتیں فراہم نہ ہو رہی ہوں‘ وہاں ایسی بے ہنگم قسم کی تقریبات زیب نہیں دیتیں۔ کھیل سے کس نے منع کیا ہے؟ اگر اس سے فزیکل فٹنس بہتر ہوتی ہے تو بہت اچھی بات ہے مگر اس کے نتیجے میں اللہ کا حق پامال نہ ہو‘ ماں باپ کے حقوق پامال نہ ہوں۔ لوگوں کی زندگی اجیرن نہ ہو۔ مال کا ضیاع نہ ہو۔ فحاشی‘ عریانی پھیلنے کا سبب نہ بنے۔ جس کرکٹ میں جوا شامل ہو گیا‘ سٹہ شامل ہو گیا‘ عورتوں کا ناچ گانا شامل ہو گیا‘ بے حیائی شامل ہو چکی‘ وہ اب صرف کھیل نہیں رہا۔ چاہے کرکٹ ہو یا پتنگ بازی‘ کم سے کم کسی مسلمان کا ایمان تو گوارا نہیں کر سکتا کہ ان چیزوں کو تسلیم کرے۔

یہ مہینہ شعبان کا ہے‘ جس میں رمضان کی طرف توجہ دلانی چاہیے۔ قرآن کریم کی طرف توجہ دلائی جائے۔ عوام کے حقوق کی بات کی جائے۔ زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ اس کے بجائے کھیل تماشے میں لگا دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کا وہ شعر یاد آتا ہے: ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یہ حکمرانوں کے tactics ہوا کرتے ہیں تاکہ اصل حقائق کی طرف عوام کی توجہ نہ رہے۔ یہ ظلم ہے‘ ستم ہے۔ ماضی میں کبھی عدلیہ نے بسنت کے خلاف فیصلہ دیا تھا‘ لیکن آج عدلیہ کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ وہ حکومت کے خلاف کیا فیصلہ دے گی! ہم سب نے اللہ کو جواب دینا ہے‘ یہ کیوں بھلا دیا جاتا ہے! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالْإِمَامُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَ هُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى أَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ، وَ عَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُ، أَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) (صحیح البخاری، ح:۷۱۳۸)

’’آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ پس امام (صاحب اقتدار) لوگوں پر نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہوگا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ کسی شخص کا غلام اپنے سردار کے مال کا نگہبان ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پرسش ہوگی۔‘‘

ایک حدیث کے مطابق کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوا اور قتل ہو گیا۔ صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا کہ شہید ہو گیا‘ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم کی آگ میں ہے‘ کیونکہ اس نے غنیمت کے مال میں سے ایک چادر چرائی تھی۔ غنیمت کا ایک حصہ

مجاہدین میں تقسیم ہوتا ہے جبکہ دوسرا حصہ بیت المال میں جاتا ہے۔ بیت المال اس معنی میں پبلک پراپرٹی ہے کہ اس کا پیسہ عوام کی بہبود پر خرچ ہوگا۔ مالِ غنیمت میں سے ایک چادر چرائی گئی تو ٹھکانا جہنم قرار پایا جبکہ آج کے حکمران سرکاری خزانے کا غیر منصفانہ استعمال کر رہے ہیں۔ کیا انہوں نے اللہ کو جواب نہیں دینا!

سورۃ التکاثر کے آخر میں ارشاد ہوا:

﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ⑧﴾

’’پھر اُس دن تم سے ضرور پوچھا جائے گا نعمتوں کے بارے میں۔‘‘

اقتدار بھی ایک طرح کی نعمت ہے۔ اللہ اس کے بارے میں پوچھے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کو ہدایت عطا کرے۔ ہمیں بھی ہدایت دے۔ ہمارے عوام کم سے کم بائیکاٹ تو کریں۔ مفت ٹرانسپورٹ پر لعنت بھیجیں۔ اپنے بچوں کو سمجھائیں۔ یہ سارا ہندوانہ رسومات کا معاملہ ہے‘ ان کی تہذیب و ثقافت کا معاملہ ہے۔ ہمیں کچھ تو خدا کا خوف کرنا چاہیے۔ عوام اس کے خلاف بات کریں اور اپنے گھر والوں اور متعلقین کو بچانے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حیا کی حفاظت فرمائے‘ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے۔ ہمیں رمضان کا مہینہ عافیت کے ساتھ عطا کرے۔ قرآن مجید کے ساتھ تعلق کی مضبوطی عطا فرمائے۔ حق کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین! ❁❁

قارئین توجّہ فرمائیں!

’’میثاق‘‘ میں شامل ایسے مضامین جن کے مصنّفین/مرتّبین کا تعلق ہمارے ادارے سے نہیں ہے‘ انہیں قارئین کی معلومات میں اضافے کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔ اشاعت سے قبل ان میں لسانی‘ واقعاتی اور زمانی اعتبارات سے ممکنہ حد تک اصلاح بھی کی جاتی ہے۔ تاہم تحریر کے انداز‘ اس میں دی گئی تفصیلات اور اسے مرتّب کرنے کے مقصد کے حوالے سے سوالات/اعتراضات کا جواب دینے کی ذمہ داری ادارے پر عائد نہیں ہوتی۔ ایسے مصنّفین کی آراء سے ادارے کا مکمل طور پر اتفاق بھی کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ اس ضمن میں صاحبِ تحریر ہی سے رجوع کیا جانا چاہیے‘ جس کا فون نمبر/ای میل/پتہ وغیرہ تحریر کے آغاز میں دے دیا جاتا ہے۔ شکریہ!

فکرِ آخرت

اعجاز لطیف‘ نائب امیر تنظیم اسلامی

(سالانہ زونل اجتماع منعقدہ نومبر ۲۰۲۵ء میں خطاب)

فکرِ آخرت ہم میں سے ہر ایک کی سب سے بنیادی فکر ہونی چاہیے۔ یہ بات بانی تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ہمیں بار بار سمجھائی‘ اور قرآن بھی یہی تلقین کرتا ہے کہ ہم اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ یہ زندگی ہمیشہ ہمیش کے لیے نہیں ملی ہے‘ بلکہ ہمیں اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمارے لیے ہر نماز میں سورۃ الفاتحہ کی آیت ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ کے ذریعے آخرت کی یاد دہانی کا اہتمام فرمایا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے: ؎

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اصل کامیابی اس دن کی ہے جب انسان کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جنت میں داخل فرما دے۔ فکرِ آخرت کا مطلب خوف نہیں ہے بلکہ احساسِ ذمہ داری ہے‘ accountability کا احساس ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو انسان کے رذائل کو ختم کرنے اور اس کی خوبیوں کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۱۹﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔‘‘

’’جس نے آخرت کا ارادہ کیا‘‘ کا مطلب ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو خلوصِ نیت کے ساتھ

آخرت کی تیاری کا پختہ عزم کرنا چاہیے۔ صرف پختہ عزم ہی نہیں بلکہ ﴿وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا﴾ کی رو سے اس کے لیے صحیح کوشش اور محنت بھی کرنی چاہیے‘ جیسا کہ اس کے لیے جِدّوجُہد کا حق ہے۔ یہاں پر خوب کہا کہنے والوں نے:

’’اس دنیا کے لیے اتنی کوشش کرو جتنا یہاں رہنا ہے‘ اور آخرت کے لیے اتنی کوشش کرو جتنا وہاں رہنا ہے۔‘‘

یہ بھی ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو سوچنا چاہیے کہ کیا ہماری ترجیح (priority) واقعی یہ ہے؟ سورۃ الحشر کی آیات ۱۸ تا ۲۰ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں یہ یاد دہانی بڑے خوب صورت طریقے سے کروائی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹﴾

’’اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو‘ اور ہر جان کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے‘ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو‘ اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور (اے مسلمانو دیکھنا!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔‘‘

پھر یہ بھی بتا دیا کہ ان دونوں رویوں کا انجام ایک جیسا نہیں ہے:

﴿لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۲۰﴾

’’(دیکھو!) برابر نہیں ہو سکتے آگ والے اور جنت والے۔ یقیناً جنت والے ہی کامیاب ہوں گے۔‘‘

اللہ تعالیٰ ہمیں دعوت دے رہا ہے کہ ذرا غور کرو‘ تم نے کل کے لیے کیا بھیجا ہے۔ یہ کل ہماری اصل زندگی ہے‘ جس کے بارے میں سورۃ الفجر میں فرمایا کہ وہاں پہنچ کر انسان کہے گا:

﴿يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۝۲۴﴾

’’اے کاش! کہ میں نے اپنی اصل زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا۔‘‘

اس اعتبار سے ہر نیکی‘ ہر خیر‘ ہر خدمت ہمارے کل کے لیے سرمایہ ہے۔ اس حقیقت کو بھول جانے والے‘ اور اسی دنیا کو اپنی منزل سمجھ لینے والے خسارے میں رہیں گے۔ جو اللہ کو یاد

رکھتے ہیں ﴿الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ﴾ (آل عمران:۱۹۱) کھڑے' بیٹھے اور اپنی کروٹوں کے بل' یعنی کوئی لمحہ خالی نہیں چھوڑتے' صرف الفاظ سے یاد نہیں رکھتے بلکہ عمل میں یاد رکھتے ہیں' وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ ان کے لیے بشارت ہے کہ ﴿اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ یعنی جنت والے ہی حقیقی معنوں میں کامیاب ہیں۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸۵ میں یہی مضمون ایک مختلف انداز سے بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوۡنَ اُجُوۡرَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّۃَ فَقَدۡ فَازَ ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۱۸۵﴾﴾

''ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے' اور تم کو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ تو قیامت ہی کے دن دیا جائے گا۔ تو جو کوئی بچالیا گیا جہنم سے اور داخل کر دیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہوگیا' اور یہ دنیا کی زندگی تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف دھوکے کا سامان ہے۔''

پتہ چلا کہ یہ دنیا دار الجزا نہیں بلکہ دار الامتحان ہے۔ بدلے کی جگہ دراصل آخرت ہے۔ اگر یہ زندگی اُس اصل زندگی کی تیاری کے لیے بسر نہیں کی گئی' اگر یہ حقیقت یاد نہیں رہی تو پھر دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں:

اَلدُّنۡیَا مَزۡرَعَۃُ الۡاٰخِرَۃِ

''یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے (ہم جو یہاں بوئیں گے وہاں پر وہی کاٹیں گے)۔''

دنیا کا فریب ختم ہو جائے گا' آخرت کی کامیابی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہے گی۔ دنیا کی کوئی کامیابی حقیقی نہیں' اگر خدانخواستہ انسان آخرت میں ناکام قرار دے دیا جائے۔ دنیا میں عہدے یا سہولیات کے لحاظ سے کسی کا چھوٹا یا بڑا ہونا کامیابی یا ناکامی کی دلیل نہیں ہے۔ اصل کامیابی آخرت کی ہے۔ آخرت کی فکر ہمیں مایوس نہیں کرتی بلکہ یہ یقین دلاتی ہے کہ زندگی کا ہر سچا قدم معنی رکھتا ہے' جس کے اصل ثمرات اور نتائج آخرت میں ملیں گے۔

﴿کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ؕ﴾ کے الفاظ میں موت کا ذکر قرآنِ مجید میں تین مرتبہ کیا گیا ہے۔ یہ بات بانیٔ محترم نے متعدد بار بتائی ہے کہ اہم باتیں قرآنِ مجید میں کم از کم دو یا اس سے زیادہ مرتبہ ضرور دہرائی جاتی ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا:

﴿کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ؕ وَ نَبۡلُوۡکُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَیۡرِ فِتۡنَۃً ؕ وَ اِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾

''ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے' اور ہم تمہیں جانچتے رہتے ہیں (پرکھتے رہتے ہیں' تمہارا امتحان لیتے رہتے ہیں) شر سے بھی اور خیر سے بھی بطور آزمائش' اور تم سب کو ہماری ہی طرف واپس آنا ہے۔''

مرزا شوق لکھنوی کا بڑا معروف شعر ہے: ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ' کل ہماری باری ہے!

تیسرا مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کو نہایت تاکید کے ساتھ بیان فرمایا' وہ ہے سورۃ العنکبوت کی آیات ۵۷ تا ۵۹:

﴿کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ۟ ثُمَّ اِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۵۷﴾﴾

''ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم ہماری ہی بارگاہ میں لوٹائے جاؤ گے۔''

البتہ یہاں خوش خبری ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اس زندگی کو آخرت کی تیاری کے لیے استعمال کیا:

﴿وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ غُرَفًا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۵۸﴾﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اعمال کیے' ہم انہیں ضرور جگہ دیں گے جنت کے بالاخانوں میں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی۔ کیا ہی اچھا اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔''

﴿الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۵۹﴾﴾

''وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا (ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا' ڈٹے رہے' جمے رہے) اور وہ اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ یہ حقیقت بتائی ہے کہ: ''ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔'' یہ نہیں کہا کہ ہر انسان کو مرنا ہے۔ اگر اس پر غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر انسان کے لیے ذائقہ اور اس کے معیارات مختلف رکھے ہیں۔ ہر انسان کا اس کے ذوق کے مطابق taste ہوتا ہے۔ کسی کو نمک زیادہ اچھا لگتا ہے' کسی کو ذرا کم اچھا لگتا ہے۔ یہ taste انسان کے اندر اس کے اعمال کی نسبت سے بنتا' بگڑتا اور ڈیویلپ کرتا رہتا ہے۔ جس کا

ذوق خدانخواستہ بگڑ گیا ہو تو اسے قرآنِ مجید کی محفل میں بھی سکون نہیں ملتا‘ لیکن جن کا ذوق صحیح ہو‘ ان کا دل اس موقع پر باغ باغ ہوتا ہے۔ جیسا ذوق اعمال کی بنا پر دنیا میں انسان نے اپنے لیے create کیا ہے‘ موت کے وقت اس کو ویسا ہی ذائقہ چکھنا پڑے گا۔ اس اعتبار سے ابھی وقت ہے کہ اپنا taste اعمالِ صالحہ کے ذریعے سے درست کر لیا جائے‘ تاکہ موت بھی انسان سے مسکراتے ہوئے ملاقات کرے۔ یہ دنیا اور اس کے اندر جو کچھ ہے‘ وہ عارضی ہے‘ جبکہ آخرت کا حسن دائمی ہے۔ سورۃ الحدید کی ان آیات پر غور کریں:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿٢٠﴾ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٢١﴾﴾

’’خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل‘ دل لگی کا سامان اور ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش ہے۔ (انسانی زندگی کی مثال ایسے ہے) جیسے بارش برستی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی روئیدگی کسانوں کو بہت اچھی لگتی ہے‘ پھر وہ کھیتی اپنی پوری قوت پر آتی ہے‘ پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو جاتی ہے‘ پھر وہ کٹ کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں بہت سخت عذاب ہے اور (یا پھر) اللہ کی طرف سے مغفرت اور (اس کی) رضا ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو سوائے دھوکے کے ساز و سامان کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے‘ وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو بھی وہ چاہے گا دے گا۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔‘‘

اسی طرح فرمایا گیا:

﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ڏ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾﴾ (الواقعة)

’’پس اس کے لیے راحت ہے‘ خوشبو ہے‘ اور نعمتوں بھری جنت ہے۔‘‘

یہ فیصلہ انسان نے خود کرنا ہے کہ وہ کس مقصد کے تحت زندگی گزار رہا ہے: عذاب کے لیے یا مغفرت اور جنت حاصل کرنے کی خاطر؟ عذاب‘ مغفرت اور جنت‘ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جبکہ اختیار انسان کا ہے۔ جیسے سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿١٤﴾﴾

’’مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت‘ جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے اور چاندی کے اور نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی اور کھیتی۔ یہ سب دنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے‘ لیکن اللہ کے پاس ہے اچھا لوٹنا۔‘‘

یہ سب کچھ صرف دنیا کی زندگی کے برتنے کا سامان ہے۔ اصل زندگی آخرت ہے۔ آخرت کی روشنی ہمیشہ کے لیے ہے۔ زندگی مختلف مرحلوں میں گزرتی جا رہی ہے‘ اور ہم موت اور آخرت سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں اصل فکر آخرت کی ہونی چاہیے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں اُخروی نجات کے میدان میں دوسروں سے آگے نکلنے کے لیے ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ﴾

’’تم سبقت اختیار کرو (آگے نکلو) اپنے رب کی مغفرت اور جنت کے حصول کے لیے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی طرح ہے۔‘‘

آسمان و زمین کی وسعتیں ختم ہو جائیں گی‘ لیکن جنت کی وسعتیں ختم نہیں ہوں گی۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران میں ہمارے سامنے رکھی:

﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٣﴾﴾

’’اور مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت کے حصول کے لیے اور اس جنت کو حاصل کرنے کے لیے جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین جتنا ہے‘ وہ تیار کی گئی ہے (اور سنواری گئی ہے) اہلِ تقویٰ کے لیے۔‘‘

یعنی یہ اُمید ہر حقیقی صاحبِ ایمان کو رکھنی چاہیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس بہت وافر جگہ موجود ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہاں جگہ کم پڑ جائے گی۔ اس حوالے سے رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ أَعَدَّهَا اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ، فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوهُ الْفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَ أَعْلَى الْجَنَّةِ)) (صحیح البخاری عن ابی ھریرۃ ؓ)

’’جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیے ہیں‘ اس کے دو درجوں میں اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین میں ہے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ سے مانگنا ہو تو فردوس مانگو‘ کیونکہ وہ جنت کا سب سے درمیانی حصہ اور جنت کے سب سے بلند درجے پر ہے۔‘‘

سورۃ الحج کے آخری رکوع میں فرمایا گیا:

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾

’’اللہ کے لیے کوشش کرو (محنت کرو‘ جِدّ و جُہد کرو) جیسا کہ اس کے لیے جِدّ و جُہد کرنے کا حق ہے۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں ایسے لوگوں میں صدقِ دل کے ساتھ شامل ہونے کی توفیق مزید عطا فرمائے!

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول ﷺ بشارت دے رہے ہیں کہ اللہ نے ایسے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے جنت میں سو درجے تیار کر رکھے ہیں‘ اور ان میں دو درجوں کے درمیان وسعت ایسی ہے جیسے زمین اور آسمان کے درمیان فرق۔ اس لحاظ سے اللہ کی جنت کی وسعتوں میں کمی نہیں ہے‘ اصل بات یہ ہے کہ ہماری طلب اور تڑپ کتنی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ارشادات میں سے ایک جامع خطبہ ہے جو عبدالرحمٰن بن اسحاق نے اپنی کتاب الزُّھّاد میں نقل کیا ہے:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ لَكُمْ مَعَالِمَ فَانْتَهُوا إِلَى مَعَالِمِكُمْ، وَ إِنَّ لَكُمْ نِهَايَةً فَانْتَهُوا إِلَى نِهَايَتِكُمْ، إِنَّ الْمُؤْمِنَ بَيْنَ مَخَافَتَيْنِ: بَيْنَ أَجَلٍ قَدْ مَضَى لَا يَدْرِي مَا اللّٰهُ صَانِعٌ فِيهِ، وَ بَيْنَ أَجَلٍ قَدْ بَقِيَ لَا يَدْرِي مَا اللّٰهُ قَاضٍ فِيهِ، فَلْيَأْخُذِ الْعَبْدُ مِنْ نَفْسِهِ لِنَفْسِهِ، وَ مِنْ دُنْيَاهُ لِآخِرَتِهِ، وَ مِنَ الشَّبَابِ قَبْلَ الْهَرَمِ، وَ

مِنَ الْحَيَاةِ قَبْلَ الْمَوْتِ، فَوَ الَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، مَا بَعْدَ الْمَوْتِ مِنْ مُسْتَعْتَبٍ، وَمَا بَعْدَ الدُّنْيَا مِنْ دَارٍ إِلَّا الْجَنَّةُ أَوِ النَّارُ))

’’اے لوگو! تمہارے لیے (دین کی) حدیں اور نشانیاں مقرر ہیں‘ پس اپنی حدوں اور نشانیوں تک ہی رہو۔ اور تمہارے لیے ایک انجام مقرر ہے‘ پس اپنے انجام تک ہی پہنچو۔ بے شک مومن دو خوفوں کے درمیان ہوتا ہے: ایک وہ مدت جو گزر چکی‘ اسے معلوم نہیں کہ اللہ نے اس میں اس کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؛ اور ایک وہ مدت جو باقی ہے‘ اسے معلوم نہیں کہ اللہ اس میں کیا فیصلہ فرمائے گا۔ پس بندہ اپنی جان کے لیے اپنی جان سے زادِ راہ لے‘ اپنی دنیا سے اپنی آخرت کے لیے (تیاری کرے)‘ اپنی جوانی سے بڑھاپے سے پہلے‘ اور اپنی زندگی سے موت سے پہلے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! موت کے بعد توبہ یا واپسی کا کوئی موقع نہیں‘ اور دنیا کے بعد کوئی ٹھکانا نہیں مگر جنت یا جہنم۔‘‘

یعنی انسانوں کے لیے کچھ نشاناتِ منزل اور سنگ ہائے میل ہیں‘ ہدایت کے اصول ہیں جو طے کیے گئے ہیں۔ پس اپنی ان منزلوں تک پہنچ جاؤ‘ یعنی اپنے رب کی طرف لوٹنے کی تیاری کرو۔ انسان کے لیے ایک انتہا ہے‘ زندگی کا خاتمہ ہے‘ اس انجام تک پہنچنے کی تیاری کرو۔ بندہ جن دو خوفوں کے درمیان ہے‘ ان پر غور کیجیے۔ ایک وہ وقت جو گزر چکا اور انسان نہیں جانتا کہ اللہ نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے اعمال کی کیا حقیقت تھی؟ وہ کس درجے میں قبول ہوئے اور کس درجے میں قبول نہیں ہوئے؟ دوسری وہ مہلت جو باقی ہے‘ اور وہ نہیں جانتا کہ اللہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ فرمانے والا ہے۔

ایسے میں یہ کرنا چاہیے کہ انسان اپنی زندگی کے حال میں‘ یعنی جو مہلت اسے میسر ہے‘ اس میں اپنے نفس کی تربیت کر لے اور اپنی دنیا سے آخرت کے لیے تیاری کر لے۔ اس دنیا کو آخرت کی تیاری میں بسر کرے۔ جوانی میں بڑھاپے کے لیے کچھ اہتمام کر لے‘ اس لیے کہ بڑھاپے میں مختلف عوارض کے باعث توانائی کا وہ معیار نہ رہے گا۔ ؎

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقتِ پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار!

اس لیے جوانی میں توبہ‘ استغفار اور نیکی کا اہتمام کرے۔

اسلام میں جوانی کا مفہوم ذرا مختلف ہے۔ اسلام میں انسان ذہنی طور پر بالغ چالیس سال میں ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ اصل جوانی چالیس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس لیے گھبرانے کی بات نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر عمر میں عمل کی توفیق دینے پر قادر ہے۔ اپنی موجودہ زندگی میں موت کے لیے کچھ توشہ تیار کر لینا چاہیے۔ مرنے کے بعد کسی کے لیے توبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے' لوٹنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ دنیا کے بعد دو ہی گھر ہیں: جنت یا جہنم۔

ہمیں اصل میں اپنی اس جنت کے لیے ساری کوشش کرنی ہے۔ یہ دنیا تیاری کا موقع ہے اور آخرت نتیجے کی جگہ۔ نبی مکرم ﷺ نے ہمیں امید دلائی ہے کہ آج کا ہر نیک عمل کل کے لیے جمع ہو رہا ہے۔ وقت' جوانی' زندگی سب اللہ کی امانت ہے جن سے آخرت کے لیے ذخیرہ تیار کرنا ہے۔ ورنہ معاملہ یہ ہے کہ: ؎

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے' پل کی خبر نہیں!
(حیرت الٰہ آبادی)

اور: ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے' باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
(انشاء اللہ خان انشا)

اور: ؎

خون کا گارا بنایا' اینٹ جس میں ہڈیاں
چند سانسوں پہ کھڑے ہیں یہ خیالی آسماں
موت کی پُرزور آندھی آ کے جب ٹکرائے گی
یہ عمارت ٹوٹ کر پھر خاک میں مل جائے گی!

اور: ؎

یہ جو کچھ دیکھتا ہے تُو' فریبِ خوابِ ہستی ہے
تخیّل کے کرشمے ہیں' بلندی ہے نہ پستی ہے

عجب دنیائے حیرت' عالمِ دورِ غریباں ہے
کہ ویرانے کا ویرانہ ہے' اور بستی کی بستی ہے!

اب اس میں ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ گرامی کی روشنی میں جو مہلتِ عمر میسر ہے' اس کو کن کاموں میں صرف کرنا ہے۔ اگلی بات آپ ﷺ نے ترجیح کے اعتبار سے ارشاد فرمائی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَحَبَّ دُنْيَاهُ اَضَرَّ بِآخِرَتِهِ، وَمَنْ اَحَبَّ آخِرَتَهُ اَضَرَّ بِدُنْيَاهُ، فَآثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى)) (رواہ احمد)

''جو دُنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کا نقصان کرے گا' اور جو آخرت سے محبت کرے گا وہ دنیا کا نقصان کرے گا۔ پس تم ترجیح دو اس کو جو باقی رہنے والی ہے اس پر جو فنا ہو جانے والی ہے۔''

باقی رہنے والی چیز آخرت ہے' فنا ہو جانے والی چیز دنیا ہے۔ اصل دانائی یہ ہے کہ باقی رہنے والی آخرت کو ترجیح دی جائے۔ اسی کو قرآنِ مجید میں بار بار ہمارے سامنے تاکید سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ القیامۃ میں فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝٢٠ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝٢١﴾

''ہرگز نہیں! بلکہ تم فوری ملنے والی (دنیا) سے محبت کرتے ہو' اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔''

سورۃ الدہر میں فرمایا:

﴿اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَاۗءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝٢٧﴾

''یقیناً یہ لوگ فوری ملنے والی (دُنیا) سے محبت کرتے ہیں اور اپنے پیچھے ایک بھاری دن (یعنی قیامت) کو چھوڑے جا رہے ہیں۔''

سورۃ الاعلیٰ میں تو براہِ راست خطاب ہے:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝١٧﴾

''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی بھی۔''

اس کا مطلب ترکِ دنیا نہیں' بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے زادِ راہ بنانا ہے۔

اب نفسِ مطمئنہ کے حصول اور جنت سے بھی بڑی نعمت کے شوق کے حوالے سے چند

باتیں عرض ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کا ایک موقوف قول ہے‘ جو مصنف ابن ابی شیبہ میں نقل کیا گیا ہے۔ نفس کے تین درجے ہیں‘ ان میں سے ایک نفسِ مطمئنّہ ہے‘ جس کے حصول کے لیے یہ جامع دعا نقل کی گئی ہے:

اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ نَفْسًا مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ، وَتَرْضَى بِقَضَائِكَ، وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ

’’اے اللہ! میں تجھ سے ایک مطمئن نفس مانگتا ہوں‘ جو تیرے دیدار پر ایمان رکھتا ہو‘ تیرے فیصلے پر راضی رہے‘ اور تیری عطا پر قناعت کرے۔‘‘

اگر یہ دعا ہماری دعاؤں میں شامل نہیں تو اللہ توفیق دے کہ ہم اسے شامل کریں۔ اس میں نفسِ مطمئنّہ کے تین اجزاء بتائے گئے ہیں: اللہ کی ملاقات پر کامل یقین‘ اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنا‘ اللہ کی عطا پر قناعت کرنا۔

سوال یہ ہے کہ جنت سے بھی بڑی نعمت کیا ہوسکتی ہے؟ اس حوالے سے امام نسائی نے نبی اکرمﷺ کی دعا کا ایک حصہ نقل کیا ہے:

اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ إِلَى وَجْهِكَ، وَالشَّوْقَ إِلَى لِقَائِكَ

’’اے اللہ! میں تجھ سے تیرے چہرۂ مبارک کے دیدار کی لذت اور تجھ سے ملاقات کا شوق مانگتا ہوں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے چہرۂ انور کی زیارت جنت سے بھی بڑی نعمت ہے‘ اور یہ اسی کو نصیب ہوگی جو جنت میں داخل ہوگا۔ یہی وہ بات ہے جس کی نوید اللہ سبحانہ وتعالیٰ دیتے ہیں:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ
عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾﴾

’’اے مطمئن جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ‘ اس حال میں کہ تو راضی بھی ہے اور (اللہ کی طرف سے) پسندیدہ بھی۔ تو میرے (خاص) بندوں میں داخل ہوجا‘ اور میری جنت میں داخل ہوجا۔‘‘

فلاحِ آخرت کے حوالے سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک ارشاد کتاب ’’تنظیم اسلامی کی دعوت‘‘ کے صفحہ ۴۴ میں نقل ہے کہ:

’’انقلاب آئے یا نہ آئے‘ نظام بدلے یا نہ بدلے‘ اگر تم اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرتے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہوگئے تو چاہے شہادت کی موت نصیب ہو یا طبعی موت‘

آخرت میں یقیناً نجات مل جائے گی۔‘‘

حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ روزمرہ کے اعمال میں آخرت کا زاویہ پیدا کریں‘ نیتوں کو پاک کریں‘ غلبہ واقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے اپنا تن‘ من‘ دھن لگادیں۔ یہی آخرت کی سرمایہ کاری ہے‘ اور اسی کے ذریعے ان شاء اللہ کامیابی حاصل ہوگی۔ اس اعتبار سے اللہ کی جنت کوئی بہت دور کی چیز نہیں‘ بلکہ متقین کے لیے بہت قریب ہے۔ جنت پانے کا قرآنی نسخہ یہ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۱۰﴾
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾﴾

’’اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے؟ وہ یہ کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو‘ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ (اس کے بدلے میں) اللہ تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں پاکیزہ رہائشیں عطا فرمائے گا۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں اس کامیابی کے حصول کے لیے جینے اور مرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ❁❁❁

ماہنامہ ”میثاق“ لاہور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزہ واقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

جنگ کے بعد دنیا نیا جنم لے گی!

ایوب بیگ مرزا

امریکہ اور یورپ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ہمیشہ یک جان دو قالب رہے ہیں۔ اب امریکہ کے موجودہ صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی سیاسی قلابازیوں اور معاشی خودغرضی کی وجہ سے ان میں دراڑ نظر آ رہی ہے۔ اس پر ہم بعد میں بات کریں گے‘ فی الحال اتحادیوں کی بنیادی پالیسی اور اس حوالے سے اکثریتی دنیا خاص طور پر اسلامی دنیا پر ان کے مکمل غلبہ کی وجہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اُن کا ملکی‘ علاقائی اور عالمی سطح پر اقتصادی اور عسکری معاملات میں قلیل المدتی اور طویل المدتی پالیسی کا انتہائی غور وفکر اور باریک بینی سے منصوبہ بندی کرنا حقیقی وجہ ہے‘ جس پر وہ بڑی ثابت قدمی اور استقامت سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اسلامی دنیا کی مغلوبیت کی وجہ ڈنگ ٹپاؤ اور ذاتی‘ سیاسی مفادات پر مبنی پالیسی ہے۔ مئی ۲۰۲۵ء میں پاک بھارت جنگ اور ایران اسرائیل جنگ درحقیقت testing testing لڑائیاں تھیں تاکہ بڑی جنگ کی تیاری ان لڑائیوں کے نتائج اور فریقین کی عسکری صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ امریکہ نے اس جنگ میں بھارت کی ہرگز کوئی عملی مدد نہ کی حالانکہ گزشتہ پون صدی کی تاریخ گواہ ہے کہ امریکہ اور بھارت فطری حلیف ہیں۔ امریکہ نے تو بھارت کی اُس وقت بھی عملی مدد کی تھی جب پاکستان سیٹو اور سنٹو میں امریکہ کا حلیف تھا۔ تب بھی امریکہ کا جھکاؤ بھارت ہی کی طرف تھا۔

۱۹۶۲ء میں چین بھارت سرحدی جھڑپیں کھلی لڑائی کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ اس دوران امریکہ نے بھارت میں اسلحہ و بارود کے ڈھیر لگا دیے تھے اور پاکستان کے احتجاج کی رتی بھر پرواہ نہ کی‘ حالانکہ بھارت اس وقت نہ صرف خود کو ایک غیر جانبدار ملک قرار دیتا تھا بلکہ Non-Alligned Movement کا اہم رکن بھی تھا۔ سوویت یونین سے بھارت کے خصوصی تعلقات بھی تھے۔ بہرحال اس سب کچھ کے باوجود گزشتہ سال مئی کی جنگ میں تب بھی امریکہ خاموش رہا جب پاکستان بھارت کے جنگی طیارے گرا کر اسے ہزیمت سے دوچار کر رہا

تھا۔ امریکہ نے اُس وقت میدان میں آ کر جنگ بند کروائی جب بھارت کی مکمل شکست نوشتۂ دیوار ہو گئی۔ ہماری رائے کے مطابق امریکہ پاکستان کی عسکری صلاحیت کی جو ٹیسٹنگ چاہتا تھا‘ وہ ہو چکی تھی اور اس نے نتائج مرتب کر لیے تھے۔ اسی طرح اسرائیل ایران جنگ میں امریکہ نے اسرائیل کی مدد صرف اس وقت کی کہ جب وہ ایران کو نیست و نابود کرنے میں ناکام نظر آیا‘ اسرائیل کی شب و روز کی بمباری ایران کی جوابی حملے کی صلاحیت کو تباہ نہ کر سکی اور وہ تل ابیب اور اسرائیل کے دوسرے شہروں پر ڈرون اور میزائل برساتا رہا۔ تب امریکہ نے آگے بڑھ کر ایران کی زیر تعمیر ایٹمی تنصیبات پر ایک بڑا حملہ کیا اور اپنے دعوے کے مطابق ایران کی ایٹمی صلاحیت کو مزید پروان چڑھنے کے حوالے سے تہ و بالا کر دیا۔ امریکہ نے ان دونوں لڑائیوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بھارت کم از کم کسی فضائی جنگ میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا بلکہ اسے عبرت ناک شکست سے بھی دوچار ہونا ہو گا جبکہ اسرائیل کے لیے بھی ممکن نہ ہو گا کہ وہ موجودہ عسکری صلاحیت کے ساتھ اکیلا ایران کو پچھاڑ سکے اور اپنی علاقائی سالمیت اور عوام کے جان و مال کا تحفظ کر سکے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ کی اسرائیل سے خصوصی تعلق کی بنیادیں کیا ہیں! امریکہ کے لیے اسرائیل کی کسی خواہش کو رد کرنا کیوں انتہائی مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن ہے؟ اس کے لیے ماضی قریب کی تاریخ کا باریک بینی سے جائزہ لینا ہو گا۔ بیسویں صدی میں عالمی سطح پر دو بڑی جنگیں ہوئیں‘ جنہیں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دو جنگوں نے صہیونیوں کی تنظیم کو ایک عالمی قوت بنا دیا۔ اس تنظیم کے دباؤ پر پہلی عالمی جنگ کے بعد اسرائیل کا تصور بالفور ڈیکلریشن کی صورت میں سامنے لایا گیا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اسرائیل دنیا کے نقشے پر آ موجود ہوا۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک سرمایہ دار یہودی کے دو بیٹوں یعنی دو سگے بھائیوں میں سے ایک نے اس خوف ناک جنگ میں برطانیہ اور اتحادیوں کا ساتھ دیا اور دوسرے بھائی نے جرمنی کا ساتھ دیا جبکہ یہ ممالک ایک دوسرے کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان دو بھائیوں میں کوئی ذہنی اور فکری اختلاف تھا بلکہ وہ اپنے والد کے پلان کے مطابق متحارب فریقین کو جنگ میں جھونک کر کمزور کرنا چاہتے تھے۔ عالمی قوت کے مرکز و محور کو لندن سے واشنگٹن منتقل کرنا چاہتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ وہ برطانیہ ہی کے ہاتھوں کروا رہے تھے۔ حقیقت میں برطانیہ جنگ جیتنے کی خاطر

خود اپنے ہاتھ کاٹ کر صہیونیوں کو پیش کر رہا تھا۔ صہیونیوں کی سوچ یہ تھی کہ اگرچہ سلطنت انگلستان اتنی بڑی اور وسیع ہے کہ اس میں سورج غروب نہیں ہوتا‘ لیکن خود برطانیہ ایک جزیرہ ہے جس کی حقیقی جغرافیائی حدود بڑی محدود ہیں۔ ویسے بھی اِس سلطنت پر اب بڑھاپا طاری ہو چکا تھا جبکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ وسیع وعریض رقبے کی حامل ایک نوخیز عالمی قوت تھی۔ پھر یہ کہ عالمی قوت کے مرکز کو لندن سے واشنگٹن منتقل کرنے سے پہلے یہودی ابتدائی تیاری کے طور پر اپنے سرمائے کا جال امریکہ میں بچھا کر وہاں کی معیشت کا اہم ستون بن چکے تھے۔ اسی سرمائے ہی کے بل بوتے پر وہ میڈیا پر بھی قبضہ کر چکے تھے۔ لہٰذا واشنگٹن عالمی قوت کے مرکز کے ساتھ ساتھ صہیونیوں کی طاقت کا مرکز بھی بن گیا۔

سرمائے کی طاقت کی عمل داری اور میڈیا کی مدد سے یہودیوں اور ان کی تنظیم نے امریکیوں سے کم وبیش وہی سلوک کیا جو اونٹ نے بدو کے خیمے میں داخل ہونے کے بعد اس سے کیا تھا۔ قِصّہ کوتاہ‘ یہودیوں نے امریکہ میں اتنی طاقت حاصل کر لی کہ ایک مرتبہ راقم کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے یہ مثال ایک سوال کے طور پر دینا پڑی کہ: امریکہ کو واشنگٹن کی سکیورٹی زیادہ عزیز ہے یا تل ابیب کی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ واشنگٹن اور تل ابیب میں اگر کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اسرائیل دھمکیوں پر اترتا ہے اور بڑا جارحانہ انداز اپناتا ہے۔ اسرائیل نے حال ہی میں غزہ میں جو غارت گری کی اور معصوم فلسطینیوں کا خون بہایا ہے‘ اس کی وجہ سے امریکی عوام کی سوچ میں تو تبدیلی آئی ہے اور اسرائیل کے خلاف نفرت کی لہر ابھری ہے لیکن امریکہ کے فیصلہ کن ادارے وائٹ ہاؤس اور پینٹاگون اب بھی مکمل طور پر صہیونیوں کی گرفت میں ہیں۔ اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھیں تو بات سمجھ میں آ جائے گی کہ گزشتہ سال کی اسرائیل ایران لڑائی محض ٹیسٹنگ تھی۔ فریقین کی عسکری قوت کا جائزہ لینے کے بعد امریکہ نے فیصلہ کیا کہ ایران میں فیصلہ کن تبدیلی کے لیے اُس کو خود میدان میں اترنا پڑے گا۔

لہٰذا اب اپنی تمام تر قوت کو جمع کر کے وہ ایران کے سر پر آ پہنچا ہے۔ یہ یقیناً ایک حقیقی جنگ ہو گی۔ البتہ امریکہ اس جنگ میں ایران کو برباد کرنے کے بجائے اس بات کو ترجیح دے گا کہ تباہ کن جنگ اور اقتصادی جکڑ بندیوں سے ڈرا کر ایران میں خامنہ ای رجیم تبدیل کر دے۔ وہاں ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو امریکہ کے اشاروں پر ناچے اور خطے میں امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کا تحفظ کرے۔ امریکہ اب بھی ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا کہ یہ ہدف

جنگ لڑے بغیر حاصل ہو جائے‘ بصورت دیگر وہ جنگی کارروائی کرے گا۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا انتہائی ضروری ہے کہ اگر امریکہ جنگ کا آپشن استعمال کرتا ہے تو یہ خطہ بُری طرح متاثر ہو گا۔ ایران حملے کا جواب امریکہ کی سرزمین تک پہنچانے کا ہرگز اہل نہیں لیکن وہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے پھیلے ہوئے عسکری اڈوں کو یقیناً نشانہ بنائے گا‘ جس سے علاقے میں ابتری پھیلے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے تمام مسلمان ممالک امریکہ کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ جنگ کا آپشن استعمال نہ کرے۔ ہماری رائے میں بھی ایسی ہنگامی صورت حال پیدا ہو گی جس سے نمٹنا انتہائی مشکل ہو جائے گا۔ ایسی بدامنی اور لاقانونیت پھیلے گی کہ یہ خطہ وحشت اور جنگ وجدل کا خوف ناک منظر پیش کرنے لگے گا۔

اسرائیل میں امریکہ کے سفیر مائیک ہکابی نے بیان دیا ہے کہ مشرق وسطیٰ پر قبضہ اسرائیل کا حق ہے‘ خدا نے یہ زمین اسرائیلیوں کو دی ہے‘ لہٰذا اسرائیل اگر لبنان‘ شام اور اردن پر قبضہ کرتا ہے تو کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ راقم کی رائے میں موصوف نے سعودی عرب کا نام سیاسی مصلحت کے تحت نہیں لیا ورنہ اسرائیلیوں کا اصل ہدف تو مدینہ منورہ ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اسرائیل اگر دریائے نیل سے دریائے فرات تک کے علاقوں پر قبضہ کر لے تو یہ ٹھیک ہو گا۔ گویا گریٹر اسرائیل کے تصور پر امریکہ کی سرکاری چھاپ لگا دی۔ امریکہ کا اپنے سفیر کی اس بات کی تردید نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اسرائیل کے خلاف اسے اپنا حکومتی موقف قرار دے رہا ہے۔

دوسری طرف یہ اطلاعات بھی آ رہی ہیں کہ امریکہ کی ایران پر حملہ کرنے میں تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چین اور روس ایران کو دفاعی سامان ارسال کر رہے ہیں۔ لہٰذا امریکہ ایران جنگ طول کھینچ سکتی ہے۔ گویا یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ دنیا کو ایک طویل خوں ریز جنگ کا سامنا ہے۔ چین کی ایک عرصے سے یہ پالیسی ہے کہ جنگ سے ہر صورت پہلو بچا کر پہلے اقتصادی لحاظ سے دنیا میں اولین پوزیشن حاصل کی جائے‘ پھر اسلحہ سازی میں امریکہ کے مقابلے پر آیا جائے۔ یہ ہدف حاصل کرنے کے لیے اسے فی الحال کافی وقت درکار ہے۔

امریکہ کے پالیسی سازوں کا ذہن سمجھنے میں اس لحاظ سے کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ وہ چین کی بے مثال اقتصادی ترقی کو اپنے لیے زبردست خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر چین کو جلد از جلد نہ روکا گیا تو کچھ عرصے بعد اس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ روس کی مالی حالت اگرچہ بہت کمزور ہے لیکن وہ ایک زبردست ایٹمی قوت ہے‘ جس سے صرفِ نظر نہیں کیا

جا سکتا۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ حالات کو کنٹرول کرنا کسی کے اختیار میں نہ رہے اور دنیا نہ چاہتے ہوئے بھی تیسری عالمی جنگ کی طرف بڑھ جائے۔ اس کے نتائج اتنے خوف ناک ہوں گے کہ امن کے خواہش مندوں کے لیے یہ تصور ہی لرزا دینے والا ہے۔

اب آ جایئے پاکستان کی طرف کہ امریکہ کو پاک بھارت جنگ کروا کر ہماری عسکری صلاحیت کی ٹیسٹنگ کی ضرورت کیوں پڑی! ہماری رائے میں امریکہ کا ایران پر پوری قوت سے حملہ یا ڈرا دھمکا کر وہاں رجیم چینج کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایٹمی پاکستان کے بغل میں امریکہ اپنی موجودگی اسرائیل اور بھارت دونوں کے لیے انتہائی ضروری سمجھتا ہے‘ وگرنہ عالمی غلبے کے حوالے سے وہ اپنے منصوبوں پر عمل درآمد نہیں کر سکے گا۔ پہلے تو یہ جان لیں کہ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن میڈیا کے سامنے یہ بات کہہ چکی ہیں کہ امریکہ نے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کرنے کے لیے ریپڈ فورس تیار کر رکھی ہے‘ جب ہم ضروری سمجھیں گے تو آناً فاناً یہ پاکستان کی تنصیبات پر حملہ آور ہو جائے گی۔ پاکستان کے لیے ان کا یہ بیان بڑا مفید ثابت ہوا اور ہم نے اپنی ایٹمی تنصیبات کو ملک بھر میں اس طرح پھیلا دیا کہ کسی کا ان پر قبضہ کرنا یا کنٹرول حاصل کرنا ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا یہ امریکی خواہش تو اب قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ بحالت موجودہ‘ پاکستان پر کسی بھی عالمی قوت کا کھلا حملہ آسان نہیں رہا کیونکہ پاکستان کی جوابی کارروائی علاقے کی بہت بڑی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان کے حوالے سے منصوبہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ایران میں رہ کر پاکستان کے خلاف تخریبی کارروائیاں کی جائیں۔ بلوچستان میں دہشت گردی کا خوف ناک حد تک بڑھنا بلاوجہ نہیں۔ ایران اور پاکستان کے بلوچستان کو ایک کر کے گریٹر بلوچستان کا منصوبہ تو پرانا ہے‘ لیکن یہ بات بھی اب واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ امریکہ بلوچستان کو ایک الگ ملک اس لیے بھی بنانا چاہتا ہے کہ وہاں کی معدنی دولت کی لوٹ کھسوٹ کر سکے۔ اسے اندیشہ ہے کہ اگر اس نے آگے بڑھ کر یہ کام نہ کیا تو چین پاکستان سے معاملات طے کر کے بلوچستان کے پوشیدہ خزانے حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں ہمیں اختر مینگل کے اس بیان کا ذکر بڑے افسوس کے ساتھ کرنا ہوگا کہ اہل پاکستان کو بلوچستان آنے کے لیے پاسپورٹ درکار ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مینگل خاندان سے ماضی میں ناقابل بیان حد تک بدترین سلوک کیا گیا۔ ان کے بڑے بھائی کو بہت عرصہ پہلے اٹھایا گیا‘ جس کا نام ونشان آج تک نہ مل سکا۔

پھر بھی انہیں اس سطح پر نہیں اترنا چاہیے کہ ’’اِدھر تم اُدھر ہم‘‘ کی بات کی جاتی۔ ان سے کہا جا سکتا ہے کہ گریٹر بلوچستان کے قیام سے ان کے حالات بدتر ہو جائیں گے۔ وہ محض ایک غلام قوم بن جائیں گے۔ آج تو پھر بھی کچھ لوگ ان کی خاطر آواز اٹھاتے ہیں‘ امریکہ ایسی آواز سننے کو بھی تیار نہیں ہوگا۔ لہٰذا ظلم کے نتیجہ میں بغاوت پر نہ اُتریں‘ جہاد سمجھ کر اصلاحِ احوال کی کوشش کریں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس حوالے سے امریکہ کسی کھلی جنگ سے گریز کر کے کیا لائحۂ عمل بناتا ہے اور بھارت کو فرنٹ پر رکھ کر بی ایل اے جیسی دہشت گرد تنظیم کو کس حد تک سپورٹ کرتا ہے۔

راقم کے لیے ٹرمپ کا پاکستان کے حکمرانوں سے پیار ومحبت کا رویہ انتہائی تشویش ناک ہے۔ یہ ہنری کسنجر کے اس مقولے کی یاد دلاتا ہے کہ امریکہ اپنے دشمنوں کی نسبت اپنے دوستوں کے لیے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ہماری رائے میں پاکستان کے خلاف اقتصادی پھندا تیار کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کا قرضہ قریباً ۱۳۵ ارب ڈالر ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق سال ۲۰۲۶ء میں قریباً ۱۹ ارب ۵۶ کروڑ ڈالر واپس کرنے کے لیے حکومت کی کوئی منصوبہ بندی نہیں۔ ملک میں سیاسی عدم استحکام اور ہنگامہ خیزی نے صورت حال میں ایسی بگاڑ پیدا کر دی ہے جو کسی صورت سلجھتی نظر نہیں آتی۔ ایک بے یقینی کی کیفیت ہے۔ بیرونِ ملک سے سرمایہ کاری آنا تو دُور کی بات ہے‘ پہلے سے موجود ملٹی نیشنل کمپنیاں پاکستان کو خیرباد کہہ رہی ہیں۔ پاکستان کے سرمایہ کاروں کو زبردست قسم کے بحران کا سامنا ہے اور وہ اپنے کاروبار غیر ممالک میں منتقل کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ غیر نمائندہ حکومت عوام کے حقیقی مسائل سے بالکل لاتعلق ہو کر حکومتی خزانے سے اپنے لیے عیش وعشرت کا سامان کر رہی ہے۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ ہر کوئی ’’اب نہیں تو کبھی نہیں‘‘ کے فارمولے کے تحت لوٹ مار میں لگا ہوا ہے۔ عالمی ادارے میرٹ اور شفافیت کے حوالے سے بار بار خبردار کر رہے ہیں لیکن حکمرانوں کے کان پر جوں نہیں رینگ رہی۔ ماہرین معاشیات خبردار کر رہے ہیں کہ تجارتی خسارہ اور بیرونی سرمایہ کاری کا فقدان ملک کی سلامتی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

اس ساری صورتِ حال کو سامنے رکھ کر پاکستان کے عوام اور حکمرانوں کے سامنے اہم ترین سوال یہ ہے: پس چہ باید کرد؟ راقم کی رائے میں چند باتیں ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اوّلین یہ کہ اس وقت جبکہ دنیا پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے ہیں‘ کیا امریکہ‘ اسرائیل اور بھارت کا ابلیسی اتحاد ثلاثہ واحد اسلامی ایٹمی قوت پاکستان سے صرفِ نظر کرے گا؟ کیا

اس پس منظر میں گریٹر اسرائیل کا قیام ایک نظریے اور دعووں سے بڑھ کر کوئی جغرافیائی حیثیت حاصل کر سکے گا؟ کیا مدینہ منورہ کو ٹارگٹ کیے بغیر اسرائیل اپنے مقاصد پورے کر سکے گا؟ کیا امریکہ خاص طور پر صدر ٹرمپ اسرائیلی عزائم کی تکمیل کے حوالے سے پسپائی اختیار کرے گا؟ مدینہ منورہ کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو پاکستان کسی صورت لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا جبکہ اب تو پاکستان اور سعودی عرب کا دفاعی معاہدہ بھی ہو چکا ہے۔ ان سب سوالوں کا جواب دینے سے پہلے ہنری کسنجر کے محولہ بالا مقولہ کو سامنے رکھیں تو پھر صدر ٹرمپ کے وزیر اعظم شہباز شریف اور فیلڈ مارشل عاصم منیر کے حوالے سے رویے کو سمجھنا کیا مشکل رہ جاتا ہے! یہاں توقف کر کے اس بات پر بھی غور کریں کہ ایک طرف خیبر پختون خوا اور مرکزی حکومت کے مابین اختلافات ہیں جبکہ دوسری طرف اس صوبے سے جڑے ہوئے افغانستان کے ساتھ ہماری خوں ریز جنگ جاری ہے۔ اس سوال میں پڑے بغیر کہ اس میں غلط کون ہے' کیا پاکستان کو یہ جنگ وارا کھاتی ہے؟ کیا مصلحت اور حکمت کا تقاضا یہ نہیں کہ پاکستان اپنی شمال مغربی سرحد کو ہر قیمت پر پُرامن بنا لے۔ وقتی طور پر ہی سہی' تحمل اور برداشت سے کام لے۔ دہشت گردوں سے مقامی طور پر نمٹنے کی کوشش کرے تاکہ مشرق میں اپنے طاقتور اور ازلی دشمن بھارت کی جارحیت پسندی کا صحیح طور پر جواب دیا جا سکے۔ کیا افغانستان کو تباہ و برباد کر دینے یا شکست فاش دینے سے دہشت گردی ختم ہو جائے گی؟

ہمیں اپنی خارجہ پالیسی کی تاریخ کا جائزہ لینا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوری بعد سے شروع ہونے والی امریکہ دوستی وقت گزرنے کے ساتھ اسی کے زیر اثر آ گئی۔ اس تاثر کو دور کرنے کے لیے فوجی آمر ایوب خان نے "Friends not Masters" نامی کتاب لکھی اور حقائق کو نظروں سے اوجھل کرنے کی کوشش کی۔ ایوب خان کے بعد خارجہ پالیسی کے امریکی کنٹرول کا مسئلہ بگڑ کر آقا اور غلام کی صورت اختیار کر گیا' اور یہ غلامی آج اپنی بدترین سطح پر ہے۔ موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جونہی ایران پر جنگ مسلط کرنے کا منصوبہ بنا' پاکستان اور افغانستان کو باہم جنگ میں الجھا دیا گیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ سامنے آیا کہ ۱۶ فروری ۲۰۲۶ء کو افغان رہنما ذبیح اللہ مجاہد کا ایران ریڈیو سے ایک انٹرویو نشر ہوا کہ اسرائیلی حملے کی صورت میں ہم ایران کی بھرپور مدد کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ رجیم چینج کے عمل میں رکاوٹ کے حوالے سے افغان عوام کی مدد بڑی مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ یاد رہے کہ صدر

ٹرمپ نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے ایران میں امریکی فوجی اتارنے کو خارج از امکان قرار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ امریکہ کے صدر ٹرمپ بگرام ایئر بیس کے حوالے سے انتہائی متنازع بیان دے چکے ہیں کہ امریکہ کو اس پر لازماً قبضہ چاہیے تاکہ چین پر آسانی سے حملہ آور ہوا جا سکے۔ اس میں اصل سوال یہ ہے کہ کیا اس حوالے سے پاکستان کو آن بورڈ لیا گیا تھا! آخری اور حتمی بات یہ ہے کہ فارسی کی ضرب المثل ''آزمودہ را آزمودن جہل است'' کے مطابق ہمیں یہ اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ امریکہ ماضی میں بھی ہمارا دشمن تھا اور مستقبل میں بھی بدترین دشمن ثابت ہوگا۔

راقم کی رائے میں اگرچہ امریکہ کو براہِ راست للکارنے کی تو ہرگز ضرورت نہیں لیکن عملی طور پر اسے یہ اجازت بھی نہیں دی جانی چاہیے کہ وہ جب چاہے' کہیں بھی اور کیسے ہی ہمیں استعمال کرے' پھر مطلب حاصل کرنے کے بعد منہ پھیر لے جیسے کہ وہ ایک عرصے سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ امریکہ ایران جنگ ہو یا ٹل جائے' ہمیں ہمیشہ کے لیے خود کو مشرق سے جوڑ لینا چاہیے۔ مغرب نہ ماضی میں ہمارا سہارا یا سجن بنا ہے' نہ کسی صورت مستقبل میں بنے گا۔ ہم اپنی تمام تر توانائیاں اقتصادی صورت حال کو بہتر بنانے اور قرضوں کی معیشت سے نجات حاصل کرنے میں لگا دیں۔ یہی ایک صورت ہے کہ پاکستان ایک باوقار ملک بن کر دنیا کے نقشہ پر موجود رہ سکے گا۔ راقم کی رائے میں چین جس کی دوستی کو ہم ہمالیہ سے بلند اور شہد سے میٹھی قرار دیتے ہیں' اس کی بلندی اور مٹھاس سے بھی ہم صرف معاشی طور پر توانا اور خوددار ملک بن کر ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ امریکہ ہی نہیں' دنیا میں کوئی بھی ملک فری لنچ نہیں دے گا۔

بالآخر ۲۸ فروری بروز ہفتہ اسرائیل نے امریکہ کی مدد اور رفاقت میں ایران پر حملہ کر دیا۔ نیتن یاہو نے جنگی تیاریاں مکمل کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جنگ ایک روحانی مشن کی تکمیل کے لیے ہے۔ راقم کی رائے میں اسی لیے اس کے آغاز کے لیے ہفتہ کے دن کا انتخاب کیا گیا' گویا یومِ سبت کو ذہن میں رکھا گیا۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے' جنگ کی حکمت عملی کے حوالے سے اُس نے اپنی تاریخ کو دہرایا ہے۔ یعنی فریق مخالف کو مذاکرات میں الجھاؤ اور جونہی اپنی تیاری مکمل ہو تو مذاکراتی عمل کے دوران ہی حملہ کر دو۔ بہرحال چند ماہ پہلے ہونے والی ایران اسرائیل جنگ کے نتائج کو سامنے رکھ کر امریکہ اپنی پوری بحری اور فضائی قوت کو مجتمع کر کے ایران پر حملہ آور ہو چکا ہے اور ایران کی سپریم کونسل کے سربراہ خامنہ ای اور فوج کے

سینئر جرنیلوں کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اُدھر عین توقع کے مطابق ایران نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ کے جن مسلمان ممالک میں امریکی اڈے موجود ہیں یا وہ ان کو اسرائیل کا سہولت کار سمجھتا ہے‘ اُن پر حملہ کر دیا ہے۔ گویا اس حوالے سے بھی امریکہ اور اسرائیل ایک تیر سے دو شکار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان ممالک اس جنگ کی زد میں آ جانے کی وجہ سے اگر سیاسی‘ معاشی اور نظریاتی حوالے سے کمزور ہوتے ہیں تو آنے والے دنوں میں اسرائیل کے لیے آگے بڑھنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ ایران پر حملہ سے پہلے دنیا بھر سے یہ خبریں آ رہی تھیں اور راقم بھی اِسی تحریر میں یہ اظہار کر چکا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک امریکہ کو بڑے اصرار سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ ایران پر حملہ نہ کرے۔ البتہ ’’واشنگٹن پوسٹ‘‘ کی اس خبر کو بیک وقت پانچ اہم رپورٹروں نے فیڈ کیا ہے کہ درحقیقت صرف اسرائیل ہی نے نہیں بلکہ سعودی عرب نے بھی بڑے زوردار انداز میں امریکہ کو ایران پر حملہ کرنے پر اکسایا۔ اگرچہ ’’واشنگٹن پوسٹ‘‘ جیسے معیاری اخبار کا کسی من گھڑت خبر کا یوں پھیلا دینا غیر متوقع ہے لیکن یہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ مسلمانوں کے مابین مزید تفرقہ ڈالنے اور اُنہیں سعودی عرب سے متنفر کرنے کی ایک شعوری کوشش بھی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم! بہرحال برسرزمین یہ صورتِ حال سامنے آ رہی ہے کہ خلیجی مسلمان ممالک پر ایران کے حملے جاری ہیں جبکہ یہ ممالک بیان دے رہے ہیں کہ اُنہیں جوابی کارروائی کا حق حاصل ہے۔ ایران اُن کی سرزمین پر قائم امریکی اڈوں پر حملہ آور ہو کر درحقیقت اُن کی خودمختاری پر حملہ آور ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دوسروں کو اپنے ملک میں اڈے قائم کرنے کی اجازت دینے سے خودمختاری مجروح نہیں ہوتی؟ کیا یہ اڈے خطے کے دوسرے ممالک کی سکیورٹی کے لیے خطرہ نہیں ہیں؟ درحقیقت جب آپ اپنی سلطنت اور اقتدار کے تحفظ کے لیے غیر سے تعاون کرتے ہیں اور اپنے بھائی کے لیے خطرہ پیدا کر دیتے ہیں تو پھر جوابی وار پر گلہ شکوہ کا حق نہیں رہتا۔

قصہ کوتاہ‘ جنگ کا ہر فریق خود کو محفوظ کرنے اور دوسرے کو نقصان پہنچانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ ایران نے آبنائے ہرمز بند کر دی ہے‘ جہاں سے روزانہ نجانے کتنے جہاز مختلف ممالک کے لیے ساز و سامان خاص طور پر تیل لے کر گزرتے تھے۔ اس سے امریکہ کا نہ سہی‘ اس کے حلیفوں کا نقصان تو ہو گا۔ چین اور روس کے مفادات کا تقاضا ہے کہ امریکہ اس جنگ میں

طویل عرصہ تک پھنسا رہے جس دوران وہ امریکہ کی عالمی چودھراہٹ پر کاری ضرب لگا سکیں۔ امریکہ کے مقابلے میں چین اور روس براہِ راست تو اس جنگ میں ہرگز نہیں کودیں گے لیکن اطلاعات کے مطابق وہ ایران کو ایسا اسلحہ فراہم کر رہے ہیں جس سے وہ اپنا ممکنہ تحفظ کر سکے اور امریکہ جیسی سپر پاور کے لیے ایران کو زیر کرنے میں کافی وقت لگے۔ اس سے امریکہ عسکری طور پر تو شاید زیادہ متاثر نہ ہو‘ البتہ قرضوں کے انبار میں دبے ہونے کے باعث اقتصادی طور پر بُری طرح پِٹ جائے گا۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ڈالر کا زوال درحقیقت امریکہ کا زوال ہو گا۔ چین اقتصادی میدان کا فاتح بننا چاہتا ہے جو کہ امریکہ کی شکست ہو گی۔ اقتصادی کمزوری بالآخر عسکری کمزوری کا باعث ہو گی۔ یہ ہے وہ لائحہ عمل جس پر چین بڑے صبر و تحمل اور استقامت سے عمل کر رہا ہے۔ دوسری جانب‘ امریکہ طاقت کے نشے میں بعض حماقتوں کا مرتکب بھی ہو رہا ہے۔ امریکہ سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایران میں اُس کا ہدف رجیم چینج ہے تو خامنہ ای کا قتل اس مقصد کے حصول کو انتہائی مشکل نہیں بنا دے گا؟ کیا خامنہ ای کو شہید کر کے اُس نے ایرانی قوم کو متحد نہیں کر دیا؟ کیا اس سے ایران کی مذہبی قیادت کی مقبولیت میں اضافہ نہیں ہو جائے گا؟ عوام میں اُس کی جڑیں ایک بار پھر مضبوط نہیں ہو جائیں گی؟ یہ قتل ایرانیوں کی غیرت و حمیت کو مزید اجاگر کرنے اور اُس کے حقیقی اظہار کا باعث نہیں بن جائے گا؟ مذہبی قیادت کی پشت پر صف بندی کی ترتیب بہتر نہیں ہو جائے گی؟ ایک اخباری کالم نگار کے مطابق ایران کی حیثیت مختلف قسم کی ہے۔ اس کی تاریخی ساخت‘ فوجی روایات اور تزویراتی طاقت کے وسائل نہ محدود ہیں اور نہ ہی صرف ایران تک محدود ہیں۔ اس کی جغرافیائی اکائی تاریخی طور پر گہری جبکہ اس کا مرکزی ’’سماجی گروہ‘‘ اس کی سیاسی طاقت‘ معیشت اور ثقافت کا امین ہے۔ اسے اندر سے توڑنا اور تقسیم کرنا اتنا آسان نہیں ہو گا جتنا بعض بیرونی طاقتوں کی نعرہ بازی میں نظر آتا ہے۔

اس جنگ کا انجام کیا ہو گا‘ یہ کہنا تو قبل از وقت ہے لیکن یہ نوشتہ دیوار ہے کہ اس جنگ کے بعد دنیا مکمل طور پر بدل جائے گی۔ تیسری عالمی جنگ نہ بھی ہو تب بھی اس جنگ کے بعد آج کی دنیا کسی صورت واپس نہیں آ سکے گی۔ اللہ تعالیٰ اُمّتِ مُسلمہ کے لیے اس جنگ سے خیر برآمد کرے۔ آمین یا ربّ العالمین!

امتحان و آزمائش (۲)

شیخ ابوکلیم مقصود الحسن الفیضی

رابعًا. امتحان و آزمائش کے میدان

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ (الانبیاء)

’’ہر جان دار موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ ہم بطریقِ امتحان تم میں سے ہر ایک کو برائی و بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں‘ اور تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔‘‘

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

قوله (وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً) يقول: نبتليكم بالشدة و الرخاء، و الصحة و السقم، و الغنى و الفقر، والحلال و الحرام، و الطاعة و المعصية، و الهدى و الضلالة))(۲۶)

یعنی ’’ہم تمہیں آزمائیں گے مصائب و آلام میں مبتلا کر کے اور دُنیوی امور کی فراوانی کے ذریعے‘ صحت اور مرض کے ذریعے‘ مال داری و تونگری اور فقر و فاقہ کے ذریعے‘ حلال اور حرام وسائل کے ذریعے‘ طاعت کی توفیق اور معصیت کے مواقع فراہم کر کے‘ اور ہدایت کی راہ دکھا کر اور ضلالت کے راستے بتا کر۔‘‘

بنی اسرائیل کے ذکر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾﴾ (الاعراف)

’’اور ہم نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں کئی گروہوں میں تقسیم کر دیا‘ ان میں کچھ تو نیک لوگ ہیں اور دوسرے ان سے مختلف ہیں‘ اور ہم انہیں اچھے حالات

[مالداری‘ آسودگی اور صحت و فراغ] اور برے حالات [مالی پریشانی‘ روزی میں تنگی اور طرح طرح کی بیماریوں] سے آزماتے رہے کہ شاید وہ اللہ کی طرف پلٹ جائیں۔‘‘

(۱) مال اور رزق میں فراخی کے ذریعے: قرآن کریم میں اس کی متعدد مثالیں ہیں‘ جیسے قومِ سبا کا قصہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾﴾ (سبا)

’’قومِ سبا کے لیے اپنی بستیوں میں قدرتِ الٰہی کی نشانی تھی‘ ان کے دائیں بائیں دو باغ تھے۔ (ہم نے ان کو کہہ دیا کہ) اپنے رب کی دی ہوئی روزی کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ یہ ہے عمدہ شہر اور وہ بخشنے والا رب ہے۔ لیکن انہوں نے روگردانی کی‘ تو ہم نے ان پر زور کا سیلاب (کا پانی) بھیج دیا اور ہم نے ان کے (ہرے بھرے) باغوں کے بدلے دو (ایسے) باغ دیے جو بدمزہ میووں والے اور (بکثرت) جھاؤ اور کچھ بیری کے درختوں والے تھے۔ ہم نے ان کی ناشکری کا یہ بدلہ انہیں دیا۔ اور ہم (ایسی) سخت سزا بڑے بڑے ناشکروں ہی کو دیتے ہیں۔ اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دے رکھی تھی‘ چند بستیاں اور (آباد) رکھی تھیں‘ جو بر سرِ راہ ظاہر تھیں‘ اور ان میں چلنے کی منزلیں مقرر کر دی تھیں۔ ان میں راتوں اور دنوں کو بہ امن و امان چلتے پھرتے رہو۔ لیکن انہوں نے پھر کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفر دور دراز کر دے۔ چونکہ خود انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنا برا کیا‘ اس لیے ہم نے انہیں (گزشتہ) افسانوں کی صورت میں کر دیا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیے۔ بلاشبہ ہر

ایک صبر و شکر کرنے والے کے لیے اس (ماجرے) میں بہت سی عبرتیں ہیں۔ اور شیطان نے ان کے بارے میں اپنا گمان سچا کر دکھایا' تو یہ لوگ سب کے سب اس کے تابع دار بن گئے' سوائے مومنوں کی ایک جماعت کے۔ شیطان کا ان پر کوئی زور (اور دباؤ) نہ تھا' مگر اس لیے کہ ہم ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ظاہر کر دیں ان لوگوں میں سے جو اس سے شک میں ہیں۔ اور آپ کا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔''

باغ والوں کا قِصّہ (سورۃ القلم)

﴿اِنَّا بَلَوۡنٰهُمۡ كَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَيَصۡرِمُنَّهَا مُصۡبِحِيۡنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا
يَسۡتَثۡنُوۡنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيۡهَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّكَ وَهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصۡبَحَتۡ
كَالصَّرِيۡمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوۡا مُصۡبِحِيۡنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰى حَرۡثِكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ
صٰرِمِيۡنَ ﴿۲۲﴾ فَانۡطَلَقُوۡا وَهُمۡ يَتَخَافَتُوۡنَ ﴿۲۳﴾ اَنۡ لَّا يَدۡخُلَنَّهَا الۡيَوۡمَ عَلَيۡكُمۡ
مِّسۡكِيۡنٌ ﴿۲۴﴾ وَّغَدَوۡا عَلٰى حَرۡدٍ قٰدِرِيۡنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوۡهَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ﴿۲۶﴾ بَلۡ
نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَ
رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَلَاوَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوۡا
يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيۡنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَنَا خَيۡرًا مِّنۡهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا
رٰغِبُوۡنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الۡعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ ۘ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾

''بے شک ہم نے انہیں اسی طرح آزمالیا جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا' جبکہ انہوں نے قسمیں کھائیں کہ صبح ہوتے ہی اس باغ کے پھل اتار لیں گے' اور ان شاءاللہ نہ کہا۔ پس اس پر تیرے رب کی جانب سے ایک بلا چاروں طرف گھوم گئی اور یہ سوہی رہے تھے۔ پس وہ باغ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔ اب صبح ہوتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کو آوازیں دیں' کہ اگر تمہیں پھل اتارنے ہیں تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی سویرے چل پڑو۔ پھر یہ سب چپکے چپکے یہ باتیں کرتے ہوئے چلے کہ آج کے دن کوئی مسکین تمہارے پاس نہ آنے پائے۔ اور لپکتے ہوئے صبح صبح گئے (سمجھ رہے تھے) کہ ہم قابو پا گئے۔ پھر جب انہوں نے باغ دیکھا تو کہنے لگے: یقیناً ہم راستہ بھول گئے۔ نہیں نہیں بلکہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔ ان سب میں جو بہتر تھا اس نے کہا کہ میں تم سے نہ کہتا تھا کہ تم اللہ کی پاکیزگی کیوں نہیں بیان کرتے؟ سب کہنے لگے: ہمارا رب پاک ہے' بے شک ہم ہی ظالم تھے۔ پھر وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے آپس

میں ملامت کرنے لگے۔ کہنے لگے: ہائے افسوس! یقیناً ہم سرکش تھے۔ کیا عجب ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر بدلہ دے دے' ہم تو اب اپنے رب سے ہی آرزو رکھتے ہیں۔ یوں ہی آفت آتی ہے' اور آخرت کی آفت بہت بڑی ہے۔ کاش انہیں سمجھ ہوتی!''

سورۃ الکہف میں دو باغوں والے کا قِصّہ

﴿وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّحَفَفۡنٰهُمَا
بِنَخۡلٍ وَّجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ﴿۳۲﴾ كِلۡتَا الۡجَنَّتَيۡنِ اٰتَتۡ اُكُلَهَا وَلَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ
شَيۡـًٔا ۙ وَّفَجَّرۡنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا
اَكۡثَرُ مِنۡكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾﴾

''اور انہیں ان دو شخصوں کی مثال بھی سنا دیں جن میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگوروں کے دے رکھے تھے اور جنہیں کھجوروں کے درختوں سے ہم نے گھیر رکھا تھا اور دونوں کے درمیان کھیتی لگا رکھی تھی۔ دونوں باغ اپنا پھل خوب لائے اور اس میں کسی طرح کی کمی نہ کی' اور ہم نے ان باغوں کے درمیان نہر جاری کر رکھی تھی۔ الغرض اس کے پاس میوے تھے۔ ایک دن اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنے ساتھی سے کہا کہ میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور جتھے کے اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط ہوں''۔

اگلی آیات میں اس واقعے کی مزید تفصیلات مذکور ہیں کہ وہ شخص اپنی جان پر ظلم کرتے ہوئے اپنے باغات میں داخل ہوا تو کہنے لگا: میں نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ کبھی برباد ہو سکتا ہے۔ پھر کہنے لگا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے' اور اگر ہوئی بھی تو میں وہاں اس سے بھی بہتر زندگی پاؤں گا۔ اس پر اُس کے ساتھی نے اسے سرزنش کی کہ تُو اپنے ربّ کی ناشکری کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھ سے یہ سب کچھ چھین بھی سکتا ہے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اُس کے باغات تباہ و برباد ہو گئے اور وہ کفِ افسوس ملتے ہوئے کہنے لگا کہ ہائے میری شامت' کاش! میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔ اُس شخص نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے اختیار کو بھلا کر ظاہری اسباب اور مادّی وسائل پر توکّل کر لیا تھا' اور یہی وہ شرک تھا جس کا خود اُس نے پھر اعتراف کیا۔

بنی اسرائیل کے تین آدمیوں کا قِصّہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے سنا کہ

بنی اسرائیل میں تین شخص تھے: ایک کوڑھی‘ دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کا امتحان لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتہ پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ تمہیں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اچھا رنگ اور اچھی جلد اور مجھ سے یہ کوڑھ کا مرض دور ہو جائے‘ کیونکہ اس کی وجہ سے لوگ مجھ سے دور دور رہتے ہیں۔ چنانچہ فرشتے نے اس پر اپنا ہاتھ پھیرا تو اس کی بیماری دور ہو گئی‘ اس کا رنگ بھی خوب صورت ہو گیا اور جلد بھی اچھی ہو گئی۔ پھر فرشتے نے پوچھا: کس طرح کا مال تم زیادہ پسند کرو گے؟ اس نے کہا: اونٹ۔ چنانچہ اسے ایک حاملہ اونٹنی دے دی گئی اور فرشتے نے دعا دیتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں برکت دے گا۔ پھر فرشتہ گنجے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ: تمہیں کیا چیز پسند ہے؟ اس نے کہا کہ عمدہ بال اور میرا موجودہ عیب ختم ہو جائے‘ کیونکہ لوگ اس کی وجہ سے مجھ سے پرہیز کرتے ہیں۔ فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا عیب جاتا رہا اور اس کے بجائے عمدہ بال آ گئے۔ فرشتے نے پوچھا: کس طرح کا مال پسند کرو گے؟ اس نے کہا: گائے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے نے اسے ایک حاملہ گائے دے دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے گا۔ پھر فرشتہ اندھے کے پاس آیا اور پوچھا کہ تمہیں کیا چیز پسند ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے آنکھوں کی روشنی دے دے تاکہ اس سے میں لوگوں کو دیکھ سکوں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے نے ہاتھ پھیرا اور اللہ تعالیٰ نے اسے بینائی واپس دے دی۔ پھر پوچھا کہ کس طرح کا مال تم پسند کرو گے؟ اس نے کہا: بکریاں۔ فرشتے نے اسے ایک حاملہ بکری دے دی۔ پھر تینوں جانوروں کے بچے پیدا ہوئے‘ یہاں تک کہ کوڑھی کے اونٹوں سے اس کی وادی بھر گئی‘ گنجے کی گائے بیل سے اس کی وادی بھر گئی اور اندھے کی بکریوں سے اس کی وادی بھر گئی۔

پھر (ایک مدت کے بعد) فرشتہ اپنی اسی پہلی شکل میں دوبارہ کوڑھی کے پاس آیا اور کہا کہ میں ایک نہایت مسکین وفقیر مسافر آدمی ہوں‘ سفر کے تمام سامان واسباب ختم ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بعد تمہارے سوا میرا اور کوئی نہیں ہے کہ اس کی مدد سے میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں‘ لہٰذا میں تم سے اسی ذات کا واسطہ دے کر جس نے تمہیں اچھا رنگ‘ اچھی جلد اور بہت سارا مال عطا کیا ہے‘ ایک اونٹ کا سوال کرتا ہوں جس سے سفر کو پورا کر سکوں۔ اس نے فرشتے سے کہا

کہ میرے ذمہ اور بھی بہت سے حقوق ہیں۔ فرشتہ نے کہا: غالباً میں تمہیں پہچانتا ہوں‘ کیا تمہیں کوڑھ کی بیماری نہیں تھی جس کی وجہ سے لوگ تم سے گھن کھاتے تھے‘ تم ایک فقیر اور قلاش نہ تھے (کہ تمہارے پاس کچھ نہ تھا)‘ پھر تمہیں اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں عطا کیں؟ اس نے کہا کہ یہ ساری دولت تو میرے باپ دادا سے چلی آ رہی ہے۔ فرشتے نے کہا کہ اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی پہلی حالت پر لوٹا دے۔ پھر فرشتہ گنجے کے پاس اپنی اسی پہلی صورت میں آیا اور اس سے بھی وہی درخواست کی اور اس نے بھی وہی کوڑھی والا جواب دیا۔ فرشتے نے کہا کہ اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی پہلی حالت پر لوٹا دے۔

اس کے بعد فرشتہ اندھے کے پاس بھی اپنی اسی پہلی صورت میں آیا اور کہا کہ میں ایک مسکین آدمی ہوں‘ سفر کے تمام سامان ختم ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بعد تمہارے سوا میرا اور کوئی نہیں ہے کہ اس کی مدد سے میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں‘ لہٰذا میں تم سے اس ذات کا واسطہ دے کر جس نے تمہیں تمہاری بینائی واپس دی ہے‘ ایک بکری کا سوال کرتا ہوں جس سے اپنے سفر کی ضروریات پوری کر سکوں۔ اندھے نے جواب دیا کہ واقعی میں اندھا تھا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے بینائی عطا فرمائی اور واقعی میں فقیر ومحتاج تھا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے مال دار بنایا۔ تم جتنی بکریاں چاہو لے سکتے ہو۔ اللہ کی قسم! تم نے اللہ کا واسطہ دیا ہے تو جتنا بھی تمہارا جی چاہے لے جاؤ‘ میں تمہیں ہرگز نہیں روک سکتا۔ فرشتے نے کہا کہ تم اپنا مال اپنے پاس رکھو‘ یہ تو صرف امتحان تھا۔ اللہ تعالیٰ تم سے راضی اور خوش ہے اور تمہارے دونوں ساتھیوں سے ناراض ہے۔[۲۷]

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا اخْتَصَّهُمْ بِالنِّعَمِ لِمَنَافِعِ الْعِبَادِ يُقِرُّهُمْ فِيهَا مَا بَذَلُوهَا، فَإِذَا مَنَعُوهَا نَزَعَهَا مِنْهُمْ، فَحَوَّلَهَا إِلَى غَيْرِهِمْ))[۲۸]

’’اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ بندوں کو اپنی نعمتوں لیے مخصوص کیا ہے تاکہ دوسرے بندوں کو فائدہ پہنچے۔ جب تک وہ خرچ کرتے رہتے ہیں اللہ ان کی نعمتیں بحال رکھتا ہے۔ جب وہ کنجوسی دکھانے پر آ جاتے ہیں‘ تو اللہ تعالیٰ ان سے نعمتیں چھین لیتا ہے‘ پھر انہیں دوسروں کی طرف پھیر دیتا ہے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إن لله عند أقوامٍ نعمًا، يقرّها عندهم ما كانُوا في حوائج النّاس مالم يملّوهم، فإذا ملّوهم نقلها إلى غيرهم))(۲۹)

''کچھ لوگوں کے پاس اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہوتی ہیں۔ جب تک وہ لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے سے نہیں اُکتاتے اللہ ان نعمتوں کو ان کے پاس رہنے دیتا ہے۔ جب وہ اُکتا جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کو دوسروں کو دے دیتا ہے۔''

ابو العلاء بن شخیر بیان کرتے مجھے بنی سلیم کے اس آدمی نے بتایا' میرا خیال ہے کہ اس نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أنَّ اللّٰهَ يَبْتَلِي عَبْدَهُ بِمَا أَعْطَاهُ، فَمَنْ رَضِيَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَهُ بَارَكَ اللّٰهُ لَهُ فِيهِ وَوَسَّعَهُ، وَمَنْ لَمْ يَرْضَ لَمْ يُبَارِكْ لَهُ))(۳۰)

''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو دے کر آزماتا ہے۔ تو جو اللہ کی تقسیم پر راضی رہا' اللہ اس میں برکت ڈال دیتا ہے اور اس میں اور اضافہ کر دیتا ہے' اور جو راضی نہ ہوا اللہ بھی اس کو برکت نہیں دیتا۔''

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے وفاتِ نبی ﷺ کے بعد کشادگیٔ رزق کو ابتلاء شمار کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:

أبتلينا مع رسول الله ﷺ بالضراء فصبرنا، ثم ابتلينا بالسراء بعده فلم نصبر(۳۱)

''ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تنگی دے کر آزمائے گئے تو ہم نے صبر کر لیا' پھر آپؐ کے بعد ہم کشادگی کے ذریعے آزمائے گئے تو ہم سے صبر نہ ہوا۔''

(۲) جاہ ومنصب کے ذریعے: بسا اوقات اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کوئی منصب دے کر آزماتا ہے کہ آیا وہ شکر سے کام لیتا ہے' یا تکبر یا گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنی خلافت کو ایک امتحان قرار دیا۔ چنانچہ خلیفہ بننے کے بعد ان کا جو پہلا خطاب تھا اس سے یہ بات واضح ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خلافت سنبھالی تو سرکاری باڈی گارڈ ان کے پاس آیا' تاکہ اسلحہ لے کر آپ کے آگے چلے' جیسا کہ اس کی سابقہ خلفاء کے وقت میں ڈیوٹی تھی۔ تو حضرت عمرؒ نے اس سے کہا: میرا تیرا کیا کام ہے' سامنے سے دور ہو جا'

میں تو ایک عام سا مسلمان ہوں۔ پھر حضرت عمرؒ بھی چلے اور سارے لوگ آپ کے ساتھ ساتھ چلے۔ مسجد میں تشریف لائے' منبر پر چڑھے' لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے۔ فرمایا: اے لوگو! مجھے میری مرضی کے خلاف یہ خلافت کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہے' نہ میری رائے لی گئی' نہ میرا مطالبہ تھا اور نہ ہی مسلمانوں سے مشورہ ہوا۔ میں نے اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے ختم کر دی ہے' جسے تم پسند کرو اپنے معاملات کا ذمہ دار بنا لو۔ لوگوں نے یک زبان نعرہ لگایا: ہم نے آپ کو چن لیا ہے۔''(۳۲)

عضد الدولہ العبیدی کا واقعہ: عضد الدولہ شیعی حاکم تاریخِ اسلام میں پہلا شخص ہے جس نے ''شہنشاہ'' کا لقب اختیار کیا۔ اس کے جاہ وجلال کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ عباسی خلیفہ الطائع لامر اللہ عضد الدولہ کا جس قدر احترام کرتا تھا' کسی اور کا نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اس سے قبل خلیفہ کے نام کے ساتھ کسی دوسرے کا نام لیا جاتا تھا۔ اس حاکم نے رفاہِ عامہ کے بہت زیادہ کام کیے۔ عضد الدولہ کو جس قدر سیاسی بصیرت حاصل تھی' اس کی مثال دنیا میں کم ملتی ہے۔ البتہ وہ نہایت جابر اور متکبر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی لونڈی سے اسے حد درجے محبت تھی' جس کی وجہ سے امورِ سیاست میں اس سے کوتاہی ہونے لگی تو اس نے اس لڑکی کو سمندر میں ڈبو دینے کا حکم دے دیا۔ اسی طرح ایک بار اسے معلوم ہوا کہ کسی غلام نے کسی شخص سے ایک بطیخ (تربوز بطور رشوت) لے لیا ہے' تو اُسے تلوار سے مار کر دو ٹکڑے کر دیا۔

اس کے ساتھ اللہ کی آزمائش کا ایک نمونہ یہ تھا کہ ایک بار وہ اپنے کسی باغ کی طرف نکلا اور کہنے لگا کہ کاش کہ آج بارش ہو جاتی تو کیا خوب تھا' تو فوراً بارش ہونے لگی۔ اس پر اُس نے ایک طویل غزل کہی جس میں عیش وشباب اور رقص وسرود کا ذکر کیا اور گانے والی لونڈیوں کی زبانی ایسے اشعار بھی کہلوا دیے جن میں انتہائی فخر ومباہات' خود ستائی' غرور وتکبر اور خدا فراموشی کا اظہار کیا گیا تھا۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: قبحه الله و قبح شعره و قبح أولاده فإنه اجترأ في أبياته هذه یعنی ''اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے دور کرے' اس کی شاعری کو برباد کرے اور اس کی اولاد کو ہلاک وبرباد کرے' کیونکہ وہ اپنے ان اشعار میں حد کو پار کر گیا۔''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت نہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے یہ اشعار پڑھے تو اسی وقت سے اسے مرگی کا مرض لاحق ہوا اور تھوڑی دیر بعد اسے دورہ پڑنے

لگا۔ جب افاقہ ہوتا تو یہ آیات دہرانے لگتا: ﴿مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ﴿۲۹﴾﴾ (الحاقۃ) ’’میرا مال میرے کسی کام نہ آیا۔ میرا اقتدار مجھ سے چھن گیا۔‘‘ اور اسی حالت میں ہلاک ہوگیا۔[۳۳]

(۳) علم کے ذریعہ آزمائش: اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو علم کے ذریعہ بھی آزماتا ہے‘ جیسا کہ سورۃ الاعراف میں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾﴾

’’اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے کہ جس کو ہم نے اپنی آیات دیں‘ پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا‘ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا‘ سو وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے‘ لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا۔ سو اس کی حالت کُتے کی سی ہوگئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ سو آپ ان واقعات کو بیان کر دیجیے شاید وہ لوگ کچھ سوچیں۔‘‘

عہدِ نبوی ﷺ میں عام یہود کا یہی حال تھا۔ آج بھی علمائے سو کا یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم دیا ہے اور قوت گویائی دے کر آزمایا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو علم نبوت بھی ایک آزمائش ہے‘ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے۔ حضرت عیاض بن حمار مجاشعی ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

((أَلاَ إِنَّ رَبِّي أَمَرَنِي أَنْ أُعَلِّمَكُمْ مَا جَهِلْتُمْ مِمَّا عَلَّمَنِي يَوْمِي هٰذَا، كُلُّ مَالٍ نَحَلْتُهُ عَبْدًا حَلاَلٌ، وَإِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ، وَإِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِينُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِينِهِمْ، وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ، وَأَمَرَتْهُمْ أَنْ يُشْرِكُوا بِي مَا لَمْ أُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا، وَإِنَّ اللهَ نَظَرَ إِلَى أَهْلِ الْأَرْضِ فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ إِلَّا بَقَايَا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، وَقَالَ: إِنَّمَا

بَعَثْتُكَ لِأَبْتَلِيَكَ وَأَبْتَلِيَ بِكَ، وَأَنْزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَابًا لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ تَقْرَؤُهُ نَائِمًا وَيَقْظَانَ))[۳۴]

’’سن لو کہ مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ میں تم کو وہ کچھ سکھاؤں جس کا تمہیں علم نہیں‘ جو کچھ اس نے مجھے آج سکھایا ہے۔ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) وہ سارا مال جو میں نے بندے کو عطا کیا ہے حلال ہے‘ اور میں نے اپنے سب بندوں کو حنیف (توحید والے) بنایا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان کے پاس شیاطین آگئے اور انہیں ان کے دین سے گمراہ کر دیا‘ اور جو چیزیں میں نے حلال کی تھیں ان کو انہوں نے حرام کر دیا۔ اور شیطانوں نے انسانوں کو حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ شرک کریں جس کی میں نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین کی طرف نگاہ کی‘ تو چند اہلِ کتاب کے علاوہ عرب وعجم سب پر ناراض ہوگیا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اے نبی ﷺ!) میں نے تمہیں اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں آزماؤں اور تمہارے ذریعے دوسروں کو بھی آزماؤں‘ اور میں نے تمہارے اوپر ایسی کتاب اتاری ہے جسے پانی نہیں دھو سکتا‘ تم اسے سوتے جاگتے پڑھو گے۔‘‘

(۴) لوگوں میں مقبولیت اور عدم مقبولیت کے ذریعہ: اگر کسی شخص کو اس دنیا میں شہرت اور لوگوں میں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے‘ تو یہ بھی ایک طرح کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے‘ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب بندوں انبیاء کو بھی اس سے آزمایا ہے۔ چنانچہ بعض نبی ایسے بھی ہوئے ہیں کہ ان پر صرف ایک ہی شخص ایمان لایا‘ بلکہ بعض نبی تو ایسے بھی گزرے ہیں کہ ان پر ایک شخص بھی ایمان نہیں لایا۔ اس کے برخلاف ایسے بھی نبی ہیں جن کے امتیوں کی تعداد کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ دو مثالیں حاضر ہیں:

(الف) نبی اکرم ﷺ جب طائف تشریف لے گئے تو وہاں لوگوں کو دعوت دی‘ عام لوگوں کو بھی دعوت دی اور خاص لوگوں کو بھی‘ ایک ایک آدمی کو بھی دعوت دی اور عام مجمع میں بھی دعوت دی۔ حضرت خالد عدوانی ؓ کا بیان ہے:

أبصر رسولَ الله ﷺ في مشرق ثقيف وهو قائم على قوس أو عصا حين أتاهم، يبتغي عندهم النصر، قال: فسمعتُه يقرأ والسماء والطارق حتى ختمها' قال: فوعيتها في الجاهلية وأنا مشرك ثم قرأتها في

الإسلام، قال: فدعتني ثقيف، فقالوا: ماذا سمعت من هذا الرجل، فقرأتها عليهم، فقال من معهم من قريش: نحن أعلم بصاحبنا، لو كنا نعلم ما يقول حقًّا لاتبعناه(۳۵)

''انہوں نے نبی کریم ﷺ کو ثقیف کے مشرق نامی بازار میں اپنی کمان یا چھڑی پر ٹیک لگائے کھڑے دیکھا' جب آپ ﷺ اہلِ طائف سے مدد کے لیے گئے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ آپ ﷺ نے سورۃ الطارق کی تلاوت کی اور اسے پورا پڑھ لیا' یہاں تک کہ میں نے اسے یاد کرلیا۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ یہ سورت میں نے اس وقت پڑھی جب میں مشرک تھا اور اسے اب حالت اسلام میں بھی پڑھ رہا ہوں۔ ان کا بیان ہے کہ اہل طائف نے مجھے بلایا اور مجھ سے پوچھا کہ اس شخص سے تم نے کیا سنا ہے؟ میں نے سورۃ الطارق پڑھ کر سنا دی تو ان کے پاس موجود قریش کے لوگوں نے کہا: ہم اپنے آدمی کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں' اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ جو یہ کہتا ہے وہ حق ہے تو ہم سب سے پہلے اس کی اتباع کر لیتے۔''

ذرا غور کریں کہ نبی مکرم ﷺ سے بہتر اور عمدہ طریقے سے وعظ کرنے والا اور آپ ﷺ سے بہتر انداز میں دعوت دینے والا دوسرا کون ہوگا' اس کے باوجود آپ ﷺ تقریر کرنے لگے تو سارے لوگ آپ ﷺ کو چھوڑ کر ہٹ گئے اور ایک اجنبی شخص ہی پاس رہ گیا' تو اسے بھی بلا لیا اور حق قبول کرنے سے روک دیا' بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ کہ آپ ﷺ طائف میں دس دن مستقل دعوت کا کام کرتے رہے لیکن ایک شخص بھی آپ ﷺ پر ایمان نہ لایا۔

ب) حضرت صہیب رومی ؓ سے مروی ہے کہ غزوۂ حنین کے موقع پر جب نبی ﷺ نماز پڑھتے تو کچھ دعائیہ کلمات آہستہ آہستہ پڑھتے' جسے ہم سمجھ نہ پاتے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کچھ آہستہ آہستہ پڑھتے ہیں' جسے ہم سمجھ نہیں پاتے (ہمیں بھی بتلایئے کہ ہم بھی پڑھا کریں)؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَطِنْتُمْ لِي؟)) قَالَ قَائِلٌ: نَعَمْ، قَالَ: ((فَإِنِّي قَدْ ذَكَرْتُ نَبِيًّا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ أُعْطِيَ جُنُودًا مِنْ قَوْمِهِ فَقَالَ: مَنْ يُكَافِئُ هَؤُلَاءِ أَوْ مَنْ يَقُومُ لِهَؤُلَاءِ؟ أَوْ كَلِمَةً شَبِيهَةً بِهَذِهِ [شَكَّ سُلَيْمَانُ] قَالَ: فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ:

اخْتَرْ لِقَوْمِكَ بَيْنَ إِحْدَى ثَلَاثٍ: إِمَّا أَنْ أُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ غَيْرِهِمْ أَوِ الْجُوعَ أَوِ الْمَوْتَ، قَالَ: فَاسْتَشَارَ قَوْمَهُ فِي ذَلِكَ، فَقَالُوا: أَنْتَ نَبِيُّ اللّٰهِ نَكِلُ ذَلِكَ إِلَيْكَ فَخِرْ لَنَا، قَالَ: فَقَامَ إِلَى صَلَاتِهِ، قَالَ: وَكَانُوا يَفْزَعُونَ إِذَا فَزِعُوا إِلَى الصَّلَاةِ، قَالَ: فَصَلَّى، قَالَ: أَمَّا عَدُوٌّ مِنْ غَيْرِهِمْ فَلَا، أَوِ الْجُوعُ فَلَا، وَلَكِنِ الْمَوْتُ، قَالَ: فَسُلِّطَ عَلَيْهِمُ الْمَوْتُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، فَمَاتَ مِنْهُمْ سَبْعُونَ أَلْفًا، فَهَمْسِي الَّذِي تَرَوْنَ أَنِّي أَقُولُ: اللّٰهُمَّ يَا رَبِّ بِكَ أُقَاتِلُ، وَبِكَ أُصَاوِلُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ))(۳۶)

''کیا تم لوگوں نے محسوس کر لیا؟ ہم نے عرض کیا: ہاں ہم لوگوں نے محسوس کیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: (آج جب میں نے تمہاری کثرت دیکھی تو) مجھے اللہ کے ایک نبی یاد آئے جنہیں ایک بڑی فوج عطا کی گئی تھی۔ جب انہوں نے اپنی فوج کی کثرت دیکھی تو کہنے لگے کہ ان کا مقابلہ کون کرسکتا ہے! اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے بارے میں آپ تین باتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو: یا تو تمہارے اوپر کسی دشمن کو مسلط کر دیا جائے' یا بھوک' یا پھر موت مسلط کر دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس بارے میں اپنی قوم سے مشورہ کیا کہ کس بات کا انتخاب کروں! قوم نے کہا: آپ اللہ کے نبی ہیں' ہم یہ معاملہ آپ کے سپرد کرتے ہیں' آپ ہی جس چیز کو مناسب سمجھیں اس کا انتخاب کرلیں۔ چنانچہ وہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے' اور وہ لوگ جب کسی چیز کے بارے میں فکرمند ہوتے تو نماز کا سہارا لیتے۔ اس نبی نے جتنی نماز پڑھنی تھی اتنی پڑھ کر فارغ ہوئے' تو پھر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اے میرے رب! ان پر کوئی دشمن مسلط ہو یا ان پر بھوک مسلط ہو' یہ قبول نہیں ہے' البتہ ان پر موت کو مسلط کر دے۔ چنانچہ ان پر مسلسل تین دن تک موت مسلط کر دی گئی' جس کی وجہ سے ان کے ستر ہزار لوگ مر گئے۔ اسی واقعہ کو یاد کر کے میرا وہ آہستہ آہستہ پڑھنا ہے' جسے تم لوگ محسوس کر رہے ہو۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوں: اَللّٰهُمَّ بِكَ أُقَاتِلُ، وَبِكَ أُصَاوِلُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ''اے اللہ! میں تیرے ہی بھروسے قتال کرتا ہوں' تیری ہی مدد سے حملہ کرتا ہوں' تیری دی ہوئی قوت سے کوشش کرتا ہوں' اور گناہوں سے رُکنے اور عبادت کو بجالانے کی طاقت تیری توفیق کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔''

یہ وہ مثالیں ہیں جنہیں لوگ ابتلاء وامتحان شمار نہیں کرتے‘ ورنہ اگر غور کیا جائے تو دنیا امتحان گاہ اور ہماری ساری زندگی ایک امتحان ہے‘ اور خوش نصیب وہی ہے جو اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھ رہا ہے۔

خامساً: آزمائش وابتلاء کے موقع پر ہمارا موقف

اللہ تعالیٰ کی طرف آزمائشوں سے نپٹنے کے لیے ہمیں درج ذیل موقف اختیار کرنا چاہیے۔ طوالت سے بچنے کی غرض سے دلائل وشواہد سے بچتے ہوئے صرف موقف ذکر کردینے پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

(۱) صبر:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝۱۵۳﴾ (البقرة)

”اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر والوں کا ساتھ دیتا ہے۔“

﴿اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝۱۰﴾ (الزمر)

”یقیناً صبر کرنے والوں ہی کو ان کا پورا پورا بے شمار اجر دیا جاتا ہے۔“

حدیث نبوی ہے: ((وَالصَّبْرُ ضِیَاءٌ)) [۳۷] ”اور صبر روشنی ہے۔“ یعنی جو آدمی مشکل حالات میں صبر سے کام لیتا ہے اسے مشکل سے نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔

(۲) ہر چیز مقدر ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے بارے حسنِ ظن کا دامن نہ چھوٹے۔

(۴) یہ مصیبت اللہ کی نعمتوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

(۵) استغفار وتوبہ

(۶) دعا‘ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جڑا رہے۔

(نظر ثانی: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور)

حواشی

(۲۶) تفسیر الطبری: الدر المنثور ۲۲۹/۵

(۲۷) صحیح البخاري: ۳۴۶۴، صحیح مسلم: ۲۶۶۴

(۲۸) الطبراني الکبیر (المجمع ۸ /۱۹۲) الطبراني الأوسط: ۵۱۵۸ . دیکھئے صحیح الترغیب ۲/ ۴۰۷)

(۲۹) الطبراني الأوسط: ۸۳۴۶‘ دیکھئے صحیح الترغیب ۳/ ۴۰۷

(۳۰) مسند احمد ۵/ ۲۴، شعب الإیمان: ۱۲۹۱، ۱۲۹۲

(۳۱) سنن الترمذي: ۲۴۶۴

(۳۲) البدایة والنهایة ۹/ ۲۱۲

(۳۳) البدایة والنهایة ۱۱/ ۳۰۰، سیر أعلام النبلاء ۱۶/ ۲۵۰

(۳۴) صحیح مسلم: ۲۸۶۵ الجنة، مسند احمد ۴/ ۱۶۱

(۳۵) مسند احمد ۴/ ۳۴۴

(۳۶) مسند احمد ۴/ ۳۳۳، صحیح ابن حبان: ۱۹۷۲

(۳۷) صحیح مسلم: ۲۲۳، سنن الترمذی: ۳۵۱۷، سنن النسائی: ۲۴۳۷

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعتِ خاص: 200 روپے اشاعتِ عام: 75 روپے

مکاشفاتِ اقبال

قیامِ پاکستان اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ

مظفر حسین

علامہ اقبالؒ ایک شاعر اور فلسفی ہونے کے علاوہ ایک حقیقت پسند سیاسی مفکر بھی تھے اور انہوں نے سیاست میں عملاً بھی حصہ لیا۔ البتہ یہ ان کی شخصیت کے اضافی پہلو ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک روحانی شخصیت تھے اور انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عصرِ حاضر میں اُمتِ مُسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ سونپا ہے اور وہ خدا کی طرف سے مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا خاص پیغام لے کر آئے ہیں۔ ؎

بے نیازانہ ز شوریدہ نوایم مگزر
مرغِ لاہوتم از دوست پیامے دارم

’’میری شاعری کو ایک جنونی کی باتیں کہتے ہوئے بے نیازی سے مت گزر جاؤ۔ میں طائرِ لاہوتی ہوں اور تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا پیغام لایا ہوں۔‘‘

پیرِ گردوں با من ایں اسرار گفت
از ندیماں رازہا نتواں نہفت

’’اللہ تعالیٰ نے یہ اسرار مجھ پر الہام کیے ہیں اور میں نے ان اسرار کو اپنے دوستوں سے چھپایا نہیں ہے۔‘‘

اپنے بارے میں یہ غیر معمولی اعتماد ان کے دو روحانی مکاشفات پر مبنی ہے جو انہیں ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۳ء میں پیش آئے۔ ان کی طرف آپ نے سید ظفر الحسن کے نام اپنے خط مورخہ ۶/اگست ۱۹۳۲ء میں ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

’’مجھے پچیس سال ہوئے جب اس کا احساس ایک عجیب و غریب طریق میں ہوا۔ اس

وقت میں انگلینڈ میں تھا۔ اس کے بعد ہندوستان میں اس کا اعادہ ہوا۔ اس کو اب کئی سال گزر چکے ہیں۔‘‘

پہلا مکاشفہ مارچ ۱۹۰۷ء میں قیامِ لندن کے دوران ہوا جس میں آپ نے قدسیوں کی زبانی سنا کہ قدرت کی طرف سے اُمتِ مُسلمہ کو دوبارہ عروج عطا ہونے والا ہے۔ سید نذیر نیازی مرحوم سے آپ نے اس مکاشفہ کی تفصیلات بھی بیان کی تھیں۔ اس کا بدقسمتی سے کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں‘ البتہ ایک غزل میں اس کا برملا اظہار ملتا ہے جو ’’بانگ درا‘‘ میں شامل ہے‘ اور یہ واحد غزل ہے جس پر بطور عنوان ’’مارچ ۱۹۰۷ء‘‘ کی تاریخ ثبت ہے۔ اس غزل میں وہ اپنے مکاشفہ کے حوالے سے فرماتے ہیں: ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اسی غزل میں انہوں نے مسلمانانِ ہند کی راہنمائی کے لیے اپنے عزم کا واشگاف اعلان کیا ہے: ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری‘ نفس مرا شعلہ بار ہو گا

نیز اسی غزل میں ان کے اس یقین کا اظہار بھی موجود ہے کہ ان کا درماندہ کارواں تمام تر مشکلات کے باوجود بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہو گا۔ ؎

سفینۂ برگِ گُل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہو گا

علاوہ ازیں نظم ’’طلوعِ اسلام‘‘ کے ابتدائی بند میں دوبارہ اسی پیش گوئی کو بڑے زوردار انداز میں پیش کیا ہے: ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا سے ہی ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

مارچ ۱۹۰۷ء کی مکاشفاتی غزل کے سولہ سال بعد چودھری محمد حسین کے نام اپنے ایک مکتوب مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال نے اپنے دوسرے روحانی مکاشفے کا ذکر کیا ہے۔ اس میں آپ نے لکھا ہے کہ عالَمِ بالا میں قدسیوں میں یہ شور مچا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو فتح اور کامرانی نصیب ہونے والی ہے لیکن زمین کے باسیوں کو اس کی کچھ خبر ہی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

" There is a lot of enthusiasm on heavens in respect of the victory of the Muslims but those on earth are silent. May God have pity on them. Our religious scholars and saints turned Islam into an ancient Asian creed."

''عالَمِ بالا میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کے بارے میں بڑا جوش و خروش ہے لیکن ساکنانِ زمین مہر برلب ہیں۔ خدا ان کے حال پر رحم فرمائے۔ ہمارے علماء وصلحاء نے اسلام کو ایک قدیم ایشیائی مذہب بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔''

علامہ اقبال کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ ہمارے علماء وصلحاء نے اسلام کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف انہی لوگوں کی تحریروں پر انحصار کرتے ہوئے اسلام کا مطالعہ کرے اور اس بات کو پیشِ نظر نہ رکھے کہ اسلام آج سے چودہ سو سال پہلے آیا تھا تو کبھی اس حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا کہ اسلام کس قدر جدید مذہب ہے۔ چنانچہ وہ اس خط میں لکھتے ہیں:

"If one studies Islam through the writings of Muslims not knowing that Islam's advent took place thirteen hundred years ago, he will not reach the conclusion that Islam is such a modern religion. I am sorry that Muslims have never recognised the modernity of Quran. They instead have interpreted its subject and truths in light of ancient peoples and thus have mutilated its real sense and intent."

''اگر کوئی شخص یہ نہ جانتا ہو کہ اسلام آج سے تیرہ سو سال پہلے آیا تھا اور اسلام کا مطالعہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی روشنی میں کرے تو کبھی اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ اسلام اس قدر جدید مذہب ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی قرآن کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے قرآن کے موضوع اور حقائق کی تشریح قدیم اقوام کی روشنی میں کر کے اس کے اصل مفہوم اور مدعا کو ہی مسخ کر ڈالا۔''

علامہ اقبال کے خط کے ان مندرجات سے جہاں یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو دوبارہ عروج حاصل ہوگا، وہاں وہ اس بات پر بھی سخت رنجیدہ اور دل گرفتہ تھے کہ مسلمانوں نے قرآن کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا۔ ہمارے علماء کی لکھی ہوئی تفاسیرِ قرآن عصرِ حاضر کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا حل پیش نہیں کرتیں اور صدیوں پرانے حالات و واقعات کے بیان سے آگے ان کے پاس کچھ کہنے کو باقی نہیں رہتا۔

علامہ اقبال نے قرآن حکیم کا مطالعہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلام کا مطمحِ نظر کشور کشائی ہرگز نہیں بلکہ وہ اپنی اعلیٰ معاشی اور جمہوری اقدار کی اساس پر معاشرہ کی تشکیل و تنظیم کے ذریعے تسخیرِ قلوب کا مقصد رکھتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نکلسن کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

''مجھے پورے وثوق کے ساتھ یقین ہے کہ علاقوں کی فتح اسلام کے اصل پروگرام کا حصہ نہیں ہے اور میرے خیال میں کشور کشائی کی مہم سے قلوب کو مسخر کرنے والی اسلام کی عالمگیر انسانی اخوت کو بے حد نقصان پہنچا اور اس نے معاشرہ میں جمہوری اور معاشی نظم پیدا کرنے اور نشوونما دینے والی ان کونپلوں کو نوچ ڈالا جو مجھے قرآن و حدیث کے صفحاتِ مقدسہ میں جابجا بکھری نظر آتی ہیں۔''

اپنے مکاشفات کی بنا پر علامہ اقبال کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عصرِ حاضر میں جب اپنی ایک آزاد منظم ریاست قائم کرنے کا موقع ملے گا تو وہ قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لا کر ایک جدید اسلامی ریاست قائم کر سکیں گے۔ چنانچہ خطبہ الٰہ آباد میں انہوں نے جب پاکستان کا نام استعمال کیے بغیر ہندوستان میں ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش

کیا تو اس میں واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ:

’’اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عرب امپیریل ازم کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں‘ اُس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب وتمدن‘ شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب ہو جائے گا۔‘‘

اسلام کے صحیح معانی کی تجدید اور زمانہ حال کی روح سے قریب تر ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ قرآن کی تشریح وتفسیر کے ذریعے دورِ حاضر کے معاشرتی‘ معاشی اور سیاسی مسائل کا حل پیش کیا جائے۔ اس چیز کو علامہ اقبال ’’قرآن کی جدیدیت‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ چودھری محمد حسین کے نام محولہ بالا خط کے آخر میں آپ لکھتے ہیں کہ مسلمان قوم کی نشاۃِ ثانیہ تو سیاسی آزادی ملنے سے حاصل ہو جائے گی لیکن اس کے بعد اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی ضرورت ہے جس کے لیے ایک ایسے مفسّرِ قرآن کی ضرورت ہے جو قرآن کی جدیدیت واضح کرے اور قرآن کی حکمتِ گمشدہ مسلمانوں کو لوٹا دے۔

"Now alongwith the renaissance of Muslim communities the renaissance of Islam is also needed. I pray to God almighty that He, for the sake of His beloved, the prophet(PBUH) produces such an interpreter among Muslims who gets at the lost wisdom once more and offers it to Ummah. Our demise is not near at hand, the Quran still holds on."

’’اب مسلم اقوام کی نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ ساتھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ بھی درکار ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک رسول اللہ ﷺ کے طفیل مسلمانوں میں ایسا مفسّرِ قرآن پیدا کرے جو اس کی ’’گمشدہ حکمت‘‘ اُمتِ مُسلمہ کو لوٹا دے۔ ہمارا خاتمہ قریب نہیں (کیونکہ) قرآن آج بھی ہمارا رہنما اور کفیل ہے۔‘‘

چودھری محمد حسین کے نام خط کا یہ آخری حصہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں علامہ اقبال نے مسلمانانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کو الگ الگ شمار کرتے ہوئے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کو قرآن حکیم کی جدیدیت کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

قیامِ پاکستان

علامہ اقبالؒ کے مکاشفات کے عین مطابق سیاسی آزادی اور قیامِ پاکستان کی صورت میں قومی نشاۃِ ثانیہ کی بات تو پوری ہو گئی لیکن اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے سلسلہ میں علامہ اقبال کا خواب ہنوز تشنہ تعبیر ہے‘ جو قرآن کی ’’جدیدیت‘‘ کو بروئے کار لانے سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے فرمایا تھا کہ اسلامی فکر کا موجودہ سرمایہ ہماری کفایت نہیں کرتا‘ کیونکہ یہ ہزار سالہ پرانی زبان میں ہے جسے دورِ حاضر کا نوجوان سمجھ نہیں سکتا اور ہزار سالہ پرانی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جو آج کہیں موجود نہیں۔ جو لوگ حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کا نام لیتے ہیں انہیں اگر کسی خطہ میں اسے قائم کرنے کا موقع مل جائے تو ناکام ہوں گے‘ کیونکہ دورِ جدید میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے جو فکری سرمایہ درکار ہے وہ ہمارے پاس موجود ہی نہیں۔

اگر مولانا مودودیؒ اور دیگر علماء اپنی زندگی یہ فکری سرمایہ فراہم کرنے کے لیے وقف کر دیتے تو پاکستان میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات بہت روشن ہو جاتے‘ لیکن انہیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ترکی کو مثال بنا کر پاکستان میں بھی سیکولرازم قدم جما لے گا۔ اس لیے انہوں نے عملی سیاست میں حصہ لینے کو ترجیح دی اور اپنے اصل کام سے غافل ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مہم جُو علماء نے بھی دین کے نام پر سیاسی جماعتیں قائم کر کے ’’دین‘‘ اور ’’سیکولرازم‘‘ کی کشمکش کو ہوا دی جس کی وجہ سے ملک میں ایک خاص قسم کی ’’سیاسی برہمنیت‘‘ کو فروغ ملا اور علماء کے مطالبۂ نفاذِ اسلام کو تھیاکریسی کے نفاذ کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ فرقہ پرست دینی جماعتوں نے جب اپنی اپنی فقہ کے نفاذ کو سیاسی مطمح نظر قرار دیا تو اسلام کو ایک وحدت خیز قوت کے بجائے انتشار انگیز سیاسی عامل سمجھا جانے لگا اور قومی اتفاقِ رائے نہ ہونے کی وجہ سے نفاذِ اسلام کی منزل دُور سے دُور ہوتی چلی گئی۔

علامہ اقبال کی آرزو کے مطابق اگر قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لایا جاتا تو پاکستان میں اسلام اور سیکولرازم کی بحث ہی نہ چھڑتی۔ لیکن ہمارے دینی رہنماؤں نے آج تک اس بات کا احساس نہیں کیا کہ سیاسی میدان میں ’’سیکولر عناصر‘‘ سے اقتدار چھیننے سے زیادہ فکری محاذ پر انہیں مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لائے بغیر ممکن نہیں۔

ہمارے علماء اسلام کو ’’قدیم ایشیائی مذہب‘‘ کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی ہیں اور اجتہادی

بصیرت سے محروم ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ ’’خطباتِ بہاول پور‘‘ میں فرماتے ہیں کہ جب قرآن حکیم نے حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کو بادشاہ کے لقب سے نوازا ہے تو ہم ملوکیت کو حرام قرار نہیں دے سکتے‘ لیکن اس کے برعکس علامہ اقبال فرماتے ہیں: ؎

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

’’میں اس جہاں پناہ کے فقر کا غلام ہوں کہ جس کے دین میں ملوکیت حرام ہے۔‘‘

علامہ اقبال ملوکیت کے حرام ہونے کی دلیل نبی کریم ﷺ کی زندگی سے لاتے ہیں‘ جنہوں نے نہ خود بادشاہت کا طریق اپنایا اور نہ ہی اپنے بعد ملوکیت کی کوئی گنجائش چھوڑی۔ یہ قرآن کے تصورِ توحید (لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ) کا اعجاز تھا کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد خلافت کی شکل میں شورائیت کا جمہوری اصول اپنایا گیا‘ جسے علامہ اقبال ’’روحانی جمہوریت‘‘ کا نام دیتے ہیں اور تشکیل و تاسیس حریت‘ مساوات اور اخوت بنی نوع آدم کو مقصود رسالتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ’’خطباتِ بہاول پور‘‘ ہی میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ فرماتے ہیں کہ عہدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے آج تک قانون سازی ایک پرائیویٹ چیز رہی ہے اور کبھی حکومت کی اجارہ داری نہیں رہی‘ جبکہ اس کے برعکس علامہ اقبال پارلیمنٹ کو اجتہاد اور قانون سازی کا حق دیتے ہیں اور اسے اسلامی حدود کا پابند رکھنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں۔ وہ الیکشن اور ووٹ کو بیعت کی جدید شکل قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبال کا موقف ہے کہ اسلام پر ملوکیت کی ہزار سالہ گرفت نے مسلمانوں میں ان اداروں کو قائم نہیں ہونے دیا اور دورِ حاضر کے پیچیدہ معاشرتی‘ معاشی اور سیاسی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بیک وقت قدیم اور جدید علوم میں جس قسم کی بصیرت درکار ہے‘ وہ کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتماعی کوشش درکار ہے جس کے لیے پارلیمنٹ کا ادارہ اجتہاد و اجتماع کے لیے فورم کا کام دے سکتا ہے۔ صرف یہی دو مثالیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ قرآن کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے اسلام کو ایک ’’قدیم ایشیائی مذہب‘‘ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ہزار سالہ پرانی روایت ملوکیت سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں‘ جبکہ اس کے برعکس علامہ اقبال روحِ عصر کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے قرآن اور اسلام کی ’’جدیدیت‘‘ کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیلۃ القدر میں قیامِ پاکستان کی معنویت

لیلۃ القدر میں پاکستان کا وجود پذیر ہونا گہری معنویت کا حامل ہے۔ سورۃ الدخان کی آیت ۳ اور ۴ میں لیلۃ القدر کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝۳ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴﴾

’’یقیناً ہم نے نازل کیا ہے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں‘ بے شک ہم خبردار کرنے والے ہیں۔ اس رات میں تمام پُرحکمت امور کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔‘‘

ان آیات میں لیلۃ القدر کی دو خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

(۱) یہ وہ رات ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا۔

(۲) یہ وہ رات ہے جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔

چنانچہ لیلۃ القدر میں پاکستان کے قیام کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے لیے اس یاددہانی کے ساتھ عمل میں آیا کہ پاکستان کی بقا‘ ترقی اور سرفرازی کا سرچشمہ حکمتِ قرآن ہے۔ یہی وہ حکمتِ قرآن ہے جسے علامہ اقبال نے ’’قرآن کی گم شدہ حکمت‘‘ قرار دیا ہے اور اس کی بازیافت کو ’’قرآن کی جدیدیت‘‘ سے موسوم کیا ہے۔

ماہِ رمضان قرآن حکیم کے ’’ریفریشر کورس‘‘ کا مہینہ ہے جس میں تراویح کی صورت میں قرآن حکیم کا دورہ مکمل کیا جاتا ہے۔ ہر سال ماہ رمضان میں لیلۃ القدر کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝۲۹﴾ (الرحمٰن) والی ذات کی طرف سے قرآن کو نئی شان کے ساتھ نازل کیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے احادیث کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ کو ہر سال ماہ رمضان میں قرآن حکیم کا دورہ مکمل کروایا کرتے تھے۔ قرآن حکیم کی اسی نئی شانِ جدیدیت کے بارے میں سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰ میں بھی بڑے واضح الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے:

﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰﴾

’’لوگو! ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے‘ تم یہ بات سمجھتے کیوں نہیں ہو!‘‘

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اگر اس آیت کے مخاطب صحابہ کرام ؓ تھے تو آج ’’فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ‘‘ کے مخاطب براہِ راست ہم لوگ ہیں۔ فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ کا مطلب اس کے سوا اور کیا لیا جا سکتا ہے کہ قرآن آج بھی ہمارے جملہ انفرادی اور اجتماعی مسائل کے سلسلے میں ہدایت کے لیے کفایت کرتا ہے بشرطیکہ ہم اسے اس انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں کہ گویا قرآن موجودہ حالات میں ہمارے لیے آج ہی نازل ہوا ہے۔ اسی طریقے سے ہم قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

قرآن حکیم کی ’’جدیدیت‘‘ کے سلسلے میں ہماری نارسائیوں کی شکایت کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں علامہ اقبال نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ روحانی اعتبار سے ہم تخیلات اور احساسات کے ایک ایسے قید خانے میں بند ہو کر رہ گئے ہیں جہاں علماء اور فقہاء کے قدیم فرسودہ خیالات کی زنجیروں نے ہمیں بری طرح جکڑ رکھا ہے‘ اور تلقین کی تھی کہ اب ہمیں ان زنجیروں کو توڑ ڈالنا چاہیے جو ہم نے گزشتہ کئی صدیوں سے اپنے گرد لپیٹ رکھی ہیں۔ پھر گہرے تاسف کے ساتھ فرمایا: ’’ہم پرانی نسل کے لوگوں کو شرم آنی چاہیے کہ ہم نے اپنی نئی نسلوں کو ان سیاسی‘ معاشی اور مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں کیا جو انہیں مستقبل میں پیش آنے والے ہیں۔‘‘

علامہ اقبال ایسے دانائے راز خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں جن پر قدرت قرآن کی جدیدیت کے راز بذریعہ الہام منکشف کرتی ہے۔ مگر قدرت کی فیاضی دیکھیے کہ علامہ اقبال کے بعد ڈاکٹر محمد رفیع الدین صحیح معنوں میں ان کے جانشین ثابت ہوئے‘ جن کی کتابیں Ideology of the Future اور ’’قرآن اور علمِ جدید‘‘ علامہ اقبال کے اس مکتبِ فکر کی مؤثر اور بھرپور نمائندگی اور ترجمانی کرتی ہیں جو قرآن کی جدیدیت کا علمبردار ہے‘ اور یہ بات ان کی کتابوں کے عنوانات سے ہی عیاں ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے بعد فکرِ اقبال کا کوئی ایسا وارث ابھی تک پیدا نہیں ہوا جو انہی کی طرح قرآن کی جدیدیت کے اسرار و رموز بیان کرے۔

قحط الرجال اور جدیدیتِ قرآن کی تلاش

سوال یہ ہے کہ اس قحط الرجال میں کیا کیا جائے؟ ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ

قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے کا کیا کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جو اس قحط الرجال کے زمانے میں ہمارے کام آ سکے! علامہ اقبالؒ اور ڈاکٹر رفیع الدینؒ جیسے دانائے راز تو روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے‘ تاہم اس کمی کی تلافی کے لیے اجتماعی کاوشیں بروئے کار لائی جا سکتی ہیں اور اس طریقِ کار کو اپنانے کی قرآن حکیم بھی بڑے واضح الفاظ میں تلقین کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾﴾ (النحل)

’’(پچھلے رسولوں کو بھی) ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا‘ اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا تا کہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اُتاری گئی ہے اور تا کہ لوگ (خود بھی) اس میں غور و فکر کریں۔‘‘

اس آیت میں یہ نکتہ انتہائی معنویت کا حامل ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جب قرآن ان پر نازل ہو رہا تھا اور آپ ﷺ اس کی تعلیم کی توضیح و تشریح بھی کر رہے تھے‘ عین اس وقت بھی قرآن حکیم اپنے ہر مخاطب سے یہ تقاضا کر رہا تھا کہ وہ خود بھی قرآن میں غور و فکر کرے اور اپنی زندگی کے جملہ انفرادی و اجتماعی مسائل کے بارے میں اس سے ہدایت طلب کرے۔ چنانچہ اگر آج ہم بھی تفکّر فی القرآن کو فقط علماء و فقہاء کا تخصص اور فریضہ نہ سمجھیں بلکہ قوم کی اجتماعی کاوشوں کو بروئے کار لائیں تو اس سے قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے میں یقیناً بڑی مدد مل سکتی ہے۔ نیز اس آیت کی رُو سے یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم میں غور و فکر ہر مسلمان کا فریضہ ہے خواہ اس کا علمی اور عقلی مرتبہ کتنا ہی فروتر کیوں نہ ہو اور وہ صرف تراجم کی مدد سے ہی قرآن کو سمجھتا ہو۔ بلاشبہ اگر ناظرہ قرآن پڑھنے والا محض تلاوتِ قرآن پر ثواب کا مستحق ہے تو تراجم کی مدد سے قرآن پر غور و خوض کرنے والا بھی اجر کا امیدوار ہو سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لانے کے لیے اجتماعی کاوش کے سلسلے میں دو تجاویز دی تھیں۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اس زمانے میں ہمارے قدیم مکاتبِ فقہ کا سرمایۂ فکر ناکافی ہو گیا ہے اور نئی اسلامی

فقہ کی ضرورت ہے تاکہ عصرِ حاضر کے نئے تقاضوں کو ادا کرنے کے لیے قانون سازی کی جا سکے۔ لیکن تنہا علماء اس کام کے اہل نہیں کیونکہ وہ جدید علم قانون اور دورِ حاضر کے نئے سماجی اور معاشی مسائل کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتے‘ اور جو مسلم وکلاء جدید علم قانون میں مہارت رکھتے ہیں‘ وہ علومِ دین سے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔ چنانچہ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ علماء اور وکلاء پر مشتمل ایک تحقیقی ادارہ قائم کر دیا جائے تو دونوں کے باہمی تعامل اور مشترکہ کوششوں سے اسلامی قانون کی از سرِ نو تشریح‘ توسیع اور حفاظت کرنے سے ایسی نئی اسلامی فقہ معرضِ وجود میں لائی جاسکتی ہے جو زمانۂ حال کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسی طرح سے آپ نے پارلیمنٹ کو بھی اجتہاد کا حق دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ لازم قرار دیا کہ پارلیمنٹ میں ایسے علماء کی ایک معقول تعداد موجود ہونی چاہیے جو قانون سازی کو اسلامی حدود کا پابند رکھنے کے لیے ایوان کی رہنمائی کر سکے۔

دوسری تجویز ملک کے تمام بڑے شہروں میں مَردوں اور عورتوں کے لیے ثقافتی ادارے قائم کرنے کے بارے میں تھی۔ اس کا مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ نوجوان نسل کو یہ بتایا جاسکے کہ انسان کی مذہبی وثقافتی تاریخ میں اسلام نے اب تک کیا کچھ حاصل کیا ہے اور ابھی کیا کچھ حاصل کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بھی قرآن اور اسلام کی جدیدیت کی تلاش ہی سے منسلک تھا۔ ان اداروں کا مقصد قرآن اور اسلام کی جدیدیت کو فروغ دینا تھا‘ اس لیے علامہ اقبال قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لانے کے لیے ایسے ادارے قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلا رہے تھے اور ان اداروں میں علماء اور غیر علماء دونوں کا اشتراک ضروری خیال کرتے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں ’’اسلام اور سائنس‘‘ کے عنوان سے Jerome R. Ravetz کا جو مقالہ شامل ہے اس میں اس نے اسلامی دنیا میں سائنس کے زوال پذیر ہونے کی بنیادی وجہ یہ بتائی ہے کہ مسلمان ممالک میں کہیں بھی سائنس کا اداراتی ڈھانچا قائم نہیں کیا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نویں صدی عیسوی میں مسلم سائنس دان علم ریاضی‘ علم ہیئت‘ علم بصریات‘ علم کیمیا اور علم طب میں شاندار پیش رفتیں کر رہے تھے لیکن ان کی یہ ترقی دیر تک قائم نہ رہ سکی‘ جس کا واحد سبب وہ یہ بیان کرتا ہے کہ:

’’مسلمان سائنس دان اگرچہ اپنی اپنی جگہ بڑے بڑے تخلیقی کارہائے نمایاں انجام

دے رہے تھے لیکن ان کی معاشرتی بنیاد (social base) بہت کمزور تھی جس کی وجہ سے ان میں وہ علمی تعاون مفقود تھا جو نچلے درجے کے سائنس دانوں کو بھی مؤثر بنا دیتا ہے۔‘‘

یہی صورتِ حال دینی علوم کی ترقی کے بارے میں ہمیں آج بھی درپیش ہے۔ چنانچہ اس جمود سے نکلنے کی بھی واحد تدبیر یہی ہے کہ دینی علوم کی تحقیق میں معاشرتی بنیاد کو وسعت دی جائے تاکہ دینی علوم کو جدیدیت آشنا کیا جاسکے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن حکیم کی تشریح وتفسیر پر کسی ایک عالم دین یا کسی ایک مکتبِ فکر کی اجارہ داری تسلیم نہ کی جائے اور قرآن حکیم میں غور وفکر کا حق ہر شخص کو دیا جائے جیسا کہ خود قرآن کا منشا ہے۔ البتہ ہر فرد کے حاصلاتِ تفکّر فی القرآن کو ثقافتی اداروں (cultural institutes) میں ایسے روشن خیال علماء کی نگرانی میں زیر بحث لایا جائے جنہیں عربی زبان اور قرآن وحدیث پر پورا پورا عبور حاصل ہو اور وہ یہ فیصلہ دینے کی صلاحیت سے بہرہ وَر ہوں کہ ان کا تفکّر فی القرآن نبی کریم ﷺ کی تشریح وتوضیح کے منافی تو نہیں اور وہ اپنے خیالات میں گمراہی کے راستے پر تو نہیں چل نکلے۔

تحریک تفکّر فی القرآن

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں حافظ نذر محمد‘ ڈاکٹر اسرار احمد‘ جاوید احمد غامدی‘ سید شبیر احمد اور ان جیسے کئی اور علماء نے نوجوان نسل میں رجوع الی القرآن کا ذوق وشوق پیدا کرنے میں شاندار خدمات انجام دی ہیں اور حلقہ ہائے درسِ قرآن قائم کر کے لوگوں کے دل میں نورِ قرآن کی شمعیں فروزاں کی ہیں۔ یہ حضرات زیادہ تر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ رجوع الی القرآن کی تحریک کے ساتھ تفکّر فی القرآن کی تحریک کا آغاز کیا جائے۔ اس غرض کے لیے پاکستان کے تمام شہروں میں جہاں جہاں بھی ممکن ہو‘ ایسے کلچرل انسٹیٹیوٹ قائم کیے جائیں جہاں تمام مکاتبِ فکر کے لوگ جمع ہوسکیں اور حالاتِ حاضرہ اور مسائل اُمّہ کو زیر بحث لا کر قرآن سے رہنمائی اور ہدایت حاصل کر سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کے موجودہ حالات انتہائی مایوس کن ہیں لیکن ہمیں اس بات کو ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان کا قیام لیلۃ القدر کی مبارک ساعتوں میں اللہ تعالیٰ کے

حکیمانہ فیصلہ کے تحت عمل میں آیا۔ لہٰذا ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ پاکستان کا مستقبل بہت روشن ہے‘ البتہ اس سلسلے میں جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے اسے پورا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ یعنی قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اجتماعی کاوشوں کو بروئے کار لائیں تاکہ علامہ اقبال کی خواہش کے مطابق پاکستان میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی راہ ہموار کی جاسکے۔

ہمارے علماء نے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مغرب زدگی اور سیکولرازم کی مہر لگا کر انہیں دینی اعتبار سے ناقابلِ اعتماد قرار دے رکھا ہے‘ حالانکہ ان میں سے کتنے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنے محدود دینی علم کے باوجود اسلام کے معاشی اور سیاسی مسائل پر جدید علوم کی روشنی میں قابل قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں دور کرنے کی بجائے قریب لایا جائے۔ علومِ تازہ کی سرمستی گناہ نہیں بلکہ کبھی کبھی یہ بھی قرآنی حقائق تک پہنچا دیتی ہے۔ ؎

کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اور: ؎

گہے رسم و رہِ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد
من از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آیم

’’کبھی کبھی عقل بھی انسان کو ذوقِ جنون بخش دیتی ہے۔ مجھے دیکھیے میں عقل مندوں کے درس سے اپنا گریباں چاک کر کے آیا ہوں‘‘۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین کا موقف تو یہ تھا:

’’ہم نے علم کو علم دین تک اور دین کو قرآن اور حدیث کے الفاظ تک محدود کر دیا‘ حالانکہ اس وقت جس قدر صحیح اور سچا علم دنیا میں موجود ہے یا آئندہ زمانوں میں انسان کی ذہنی کاوش سے پیدا ہونے والا ہے وہ علم دین کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس زمانہ میں علوم کی ترقی قرآن کو بہت آگے لے گئی ہے لیکن ہم وہیں کے وہیں ہیں‘ بلکہ قرآن آگے جا رہا ہے اور ہمارا رخ پیچھے کی طرف ہے۔‘‘

اپنے اس موقف کے بارے میں انہیں اتنا یقین اور اس حد تک اعتماد تھا کہ انہوں نے علم جدید کا

قرآن حکیم کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کو نبوت سے ’’معنوی قرب‘‘ قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

’’ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ اسلام کی والہانہ محبت کا جو مقام مسلمانوں کو اسلام کے ابتدائی دور میں حاصل تھا وہ پھر کبھی عود نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا ہے: ((خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم)) لیکن ہم اس حدیث کی ایسی تشریح نہیں کر سکتے جو قرآن اور حدیث کے باقی ارشادات سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔‘‘

’’نبوت کا قرب ایسا ہے جیسے چراغ کی روشنی کہ جوں جوں ہم اس سے دور ہوتے جائیں‘ کم ہوتی جاتی ہے‘ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں تک ایمان اور اعتقاد کا تعلق ہے‘ خیر القرون جیسا زمانہ کبھی عود نہیں کر سکتا۔ حضورﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں کو جو اسلام کی شدید محبت حاصل تھی اگرچہ نبوت کی ہدایت کے بغیر اس کا حصول ہرگز ممکن نہیں لیکن وہ کوئی ایسا کمال نہیں تھا جو انسان کو نبوت کے زمانی قرب سے ہی حاصل ہو سکتا ہو اور جس کے لیے انسان کی فطرت کے اندر مستقل طور پر کوئی سامان نہ رکھا گیا ہو۔ نبوت کے زمانی قرب نے ہمیں ایمان کی جس دولت سے مالا مال کیا تھا‘ اب نشأۃِ ثانیہ میں نبوت کا معنوی قرب جو فلسفہ اور سائنس کے ذریعہ سے حاصل ہوگا پھر ہمیں اس سے مالا مال کرے گا اور یہ ایسا قرب ہوگا جسے زوال نہیں اور جو مرورِ زمانہ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتا رہے گا۔‘‘

چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

’’ہو سکتا ہے کہ اسلام کا یہ آخری دور ابتدائی دور سے بھی بہتر ثابت ہو۔ حضورﷺ نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے حوصلہ افزا الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے: ’’خوش ہو جاؤ‘ خوش ہو جاؤ‘ بے شک میری اُمت کی مثال بارش کی طرح ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا بہتر ہے یا انتہا۔‘‘ (مشکوٰۃ)

ڈاکٹر رفیع الدین اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ انسان کا ذہن کوئی ایسی علمی حقیقت دریافت نہیں کر سکتا جو فی الواقع ایک سچی حقیقت تو ہو لیکن قرآن کی تشریح و تفسیر نہ ہو۔ ان کا موقف بڑا دوٹوک ہے:

’’سائنس اور فلسفہ کی ہر ترقی خواہ وہ دنیا کے کسی مقام پر اور کسی شخص کی وجہ سے ظہور میں آئے‘ قرآن کے درخت میں ایک نیا پتا‘ نئی شاخ یا ایک نیا پھول یا پھل ہے۔ چونکہ علم

کی ترقی جاری رہے گی اور علم وحی نبوت کی رہنمائی میں آخر کار اغلاط سے پاک ہوتا رہے گا' ظاہر ہے کہ قرآن کی شاخیں پھل' پھول اور پتے قیامت تک نکل نکل کر نوعِ انسانی کو بہارِ حسن دکھاتے رہیں گے اور اس کی ہر قسم کی ترقیوں کو ممکن بناتے رہیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب قرآن کے علم کا درخت پھیل کر تمام کائنات کا احاطہ کرے گا اور دنیا کا سارا علم اپنی ساری وسعتوں کے باوجود فقط قرآن کا علم ہوگا۔''

مختصر یہ کہ ڈاکٹر رفیع الدین اس بات میں پختہ یقین رکھتے تھے کہ قرآن حکیم جدید علوم یعنی فلسفہ و سائنس کے تمام حقائق کو علم وحی کی روشنی میں اغلاط سے پاک کر کے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی چیز کو علامہ اقبال نے جدیدیتِ قرآن سے تعبیر کیا ہے اور اسے دورِ حاضر میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی' جو پاکستان کی غرض و غایت ہے' لازمی شرط ٹھہرایا ہے۔

چنانچہ ہمارا یہ خیال ہے کہ جدیدیتِ قرآن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پاکستان میں تفکّر فی القرآن کی جان دار اور زوردار تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ قرآن ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پکار رہا ہے کہ: کیا تمہارے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں کہ تم قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ عام مسلمان اس پکار کا مخاطب صرف اور صرف علماء کرام کو سمجھتا ہے۔ ہمارے علماء بھی قرآن حکیم میں عام مسلمانوں کو فرداً فرداً غور کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے کیونکہ وہ انہیں اس کا اہل ہی نہیں سمجھتے۔

آخری بات

قرآن کی جدیدیت کے ذریعے علامہ اقبال نے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا جو خواب دیکھا تھا اس کا ذکر انہوں نے مکاشفاتی انداز میں ''پیامِ مشرق'' کی نظم ''نقشِ فرنگ'' میں بھی کیا ہے۔ اس میں وہ پوری تحدی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ مغربی سرمایہ دارانہ استعمار کا قائم کردہ ظالمانہ عالمی نظام یقینی طور پر ختم ہو کر رہے گا اور اس کی جگہ اسلام کا منصفانہ عالمی نظام لے گا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں: ؎

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی درپئے تعمیر جہانِ دگر است

''آنکھ کھول اور دیکھ اگر تیری آنکھ نورِ بصیرت رکھتی ہے کہ زندگی ایک نیا جہاں تعمیر کرنے کے درپے ہے۔''

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم
چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

''میں دنیا کی خاکِ کہن میں گوہر زندگی دیکھ رہا ہوں اور مجھے خاک کا ہر ذرہ اس انتظار میں آنکھیں کھولے نظر آتا ہے۔''

دانہ راکہ بآغوشِ زمیں است ہنوز
شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم

''وہ دانہ جو ابھی زیرِ زمین پوشیدہ ہے' میں اسے جوان ہوتے اور شاخ در شاخ پھلتا پھولتا دیکھ رہا ہوں۔''

کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم
پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم

''مجھے (مغربی تہذیب کا) پہاڑ تنکے کی مانند ہلکا نظر آتا ہے اور پرِ کاہ [اسلام اپنی موجودہ کمزور حالت میں بھی] مجھے کوہِ گراں نظر آتا ہے۔''

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

''وہ انقلاب جو آسمانوں کے ضمیر میں نہیں سما رہا وہ مجھے صاف نظر آ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ کیسے نظر آ رہا ہے۔''

''بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم'' کے الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ان اشعار میں اسی دوسرے مکاشفہ کا بیان ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے چودھری محمد حسین کے نام اپنے خط (مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۲۳ء) میں کیا۔ ''پیامِ مشرق'' کی اشاعت بھی اس خط سے تین ماہ قبل (مئی ۱۹۲۳ء) ہوئی تھی اور نظم ''نقشِ فرنگ'' میں ہی آپ نے یہ پیام دیا ہے کہ ''وقت آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم'' (وقت آ گیا ہے کہ ہم نیا آئین بروئے کار لائیں)۔ یہ ''آئینِ دگر'' قرآن ہی کا آئین ہے جو بقول اقبال قرآن کی جدیدیت پر استوار ہوگا۔

قرآن حکیم چودہ سو سال قبل نازل ہوا۔ اس کے ایک ایک لفظ‘ ایک ایک حرف بلکہ زیر و زبر تک کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور اس بنا پر قرآن ہمیشہ کے لیے ناقابل تحریف ہے۔ تاہم اس کے الفاظ کی وسعتِ معانی لامحدود ہے‘ یعنی بقول اقبال:
ع ’’صد جہاں باقی است در قرآں ہنوز‘‘۔ لیلۃ القدر ہر سال ہمارے لیے قرآن کی معنوی تازگی کا یہی پیغام لاتی ہے جسے علامہ اقبال قرآن کی ’’جدیدیت‘‘ سے موسوم کرتے ہیں اور اسے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔

شبِ نزولِ قرآن میں پاکستان کا قیام قدرت کی طرف سے ہمارے لیے ایک اشارہ ہے کہ تفکّر فی القرآن کے ذریعے قرآن کی جدیدیت کا سراغ لگا کر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا آغاز کریں اور دنیا کو اسلامی عدل و احسان کے اس نئے عالمی نظام سے روشناس کرائیں جس کا آج سیاسی اور معاشی استحصال کی ماری مجبور و مقہور انسانیت کو شدّت سے انتظار ہے۔

❀❀❀

بقیہ: درسِ قرآن (سورۃ البقرۃ)

لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا کہ یہ میرا راز ہے‘ کسی کو بتانا نہیں۔ اسی لیے ان کا نام پڑ گیا تھا: صَاحِبُ سِرِّ النَّبِیِّ! ’’نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز دان۔‘‘ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان سے پوچھا کرتے تھے: ’’اے حذیفہ! مَیں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھ رہا ہوں کہ کہیں میرا نام تو ان میں نہیں!‘‘ اگر واقعتاً ہمارے اندر ایمان ہے تو ہماری یہ کیفیت ہونی چاہیے۔ فرائضِ دینی کا جامع تصوّر ہر وقت ہمارے سامنے ہونا چاہیے کہ دین صرف نماز‘ روزے کا نام نہیں‘ یہ صرف کوئی کلچر نہیں‘ بلکہ دین ایک دعوت‘ حرکت اور تحریک ہے۔ اگر ہم اس کے تقاضوں کو پورا نہ کریں اور کہیں ہمارے اعصاب جواب دے جائیں تو گویا کہ ہر آن خطرہ ہے کہ نفاق کی بیماری ہم پر حملہ آور ہو جائے۔

اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ! اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ! اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ!

(جاری ہے)

❀❀❀

Apr. 2026
Vol. 75

Regd. CPL No.115
No.4

Monthly **Meesaq** Lahore

PHARMA

Your **Health**
Our **Devotion**

NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical Manufacturing & Marketing Company, offering wide range of high quality branded generics in all therapeutic categories for domestic and international markets. Specializes in manufacturing complete range of Oral Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams, Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than **40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa**

INNOVATION TECHNOLOGY COMPLIANCE

www.nabiqasim.com